نازل فرمائے اور ہر طرح کے انعامات سے مالامال فرمائے۔ دمشق کے دوران قیام میں ناچیز سے بالکل پدرانہ تعلق رہا۔ حضرت مولانا علی میاں مدظلہ العالی کی نسبت سے اور دار العلوم ندوۃ العلماء کے فرستادہ ہونے کی حیثیت سے ناچیز سے غایت درجہ کا سلوک کرتے اور حد درجہ محبت سے پیش آتے بلکہ اکثر فرمایا کرتے تھے کہ جس طرح آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت سلمان فارسیؓ کے متعلق فرمایا ہے "سلمان منا اھل البیت" (سلمانؓ ہم اہل بیت میں سے ہیں) اس طرح میں تم کو "فاروق منا اھل البیت" کہتا ہوں۔ یہ بالکل سچی بات تھی کہ حضرت شیخ کے یہاں ناچیز نے جتنی مدت بھی گذاری اس دوران بالکل اپنے گھر اور خویش واقارب کے درمیان رہنے کا لطف حاصل رہا اور غریب الوطنی یا اجنبیت کا بالکل احساس نہیں ہونے پایا۔ حضرت شیخ اپنے اسی تعلق اور محبت کی بنا پر ناچیز کو ۱۹۷۷ء میں حج بیت اللہ شریف اپنے ہمراہ لے جانا پسند فرمایا اور اس کے لئے ہر طرح کا انتظام فرمایا۔ اس طرح اللہ تعالیٰ نے وہ دیرینہ آرزو پوری فرمائی جس کی ناچیز شروع سال سے خواہش رکھتا تھا، اور حسن اتفاق سے حضرت مولانا علی میاں مدظلہ العالی بھی دو تین سال کے بعد اسی سال حج کی نیت سے مکہ مکرمہ تشریف لائے اور اللہ تعالیٰ نے ان دو بزرگ ہستیوں کی معیت اور سرپرستی میں حج بیت اللہ کی سعادت نصیب فرمائی۔ اس پر اللہ تعالیٰ کا جتنا بھی شکر ادا کیا جائے کم ہے۔

یہ ناچیز اپنے خانگی حالات کے پیش نظر صرف تین سال کا خاکہ ذہن میں رکھ کر حضرت شیخ کی خدمت میں حاضر ہوا تھا لیکن شیخ کے قلبی تعلق اور ان کے پیہم اصرار کو دیکھ کر مزید ایک سال رہ کر ان کے علمی و روحانی فیوض سے مستفید ہونے کا فیصلہ کیا۔ جب یہ مدات ختم ہوئی اور حج سے واپسی دمشق کو ہوئی تو حضرت مولانا علی میاں مدظلہ العالی کی رائے کے مطابق اپنے وطن واپسی کا پروگرام طے کیا اور حضرت شیخ سے رخصتی کی اجازت چاہی درانحالیکہ ناچیز پر گریہ کا عالم طاری تھا۔ حضرت شیخ نے بحالت مجبوری مجھے روانگی کی اجازت دی اور ہر قسم کا انتظام فرما کر اور مکمل اہتمام واکرام کے ساتھ خود آپ اپنے تمام متعلقین کے ہمراہ دمشق ہوائی اڈہ پر (جب کہ زمانہ سردیوں کا تھا اور جہاز کی روانگی رات میں تھی) تشریف لاکر ناچیز کو رخصت کیا اور بہت ہی دعائیں دیں۔ اگرچہ حضرت کی دلی رغبت یہ تھی کہ ناچیز مزید کچھ قیام کرے چنانچہ اس کا اظہار انہوں نے ناچیز کے نصیحت نامہ میں یہ عربی کا شعر لکھ کر کیا ہے ؎

ولو نعطی الخیار لما افترقنا

ولکن لا خیار مع الزمان

(اگر ہم کو اختیار دیا جاتا تو ہم جدا نہیں ہوتے، لیکن زمانہ میں کسی کو اختیار نہیں ہے)

مگر مخصوص حالات کے پیش نظر وہ اجازت دینے پر مجبور ہوئے۔ ناچیز حضرت شیخ سے رخصت ہوا اور اس نیت کے ساتھ کہ انشاء اللہ دوبارہ جلد ہی حضرت کی زیارت کے لئے آجاؤں گا، چنانچہ اب کی رمضان میں خیال تھا کہ اسکی نوبت آئے گی لیکن علالت اور دیگر مجبوریوں کے پیش نظر یہ سفر نہیں ہو سکا۔ دوبارہ یہ بات دل میں گذر رہی تھی کہ حضرت مولانا علی میاں مدظلہ العالی امسال ذی قعدہ میں رابطہ کے اجلاس میں شرکت کے لئے جائیں گے اور وہاں پر حضرت شیخ بھی آئیں گے تو انشاء اللہ ملاقات ہو گی۔ اس طرح پھر ایکبار مولانا مدظلہ کی معرفت حضرت شیخ کو زیارت ہند کی دعوت دی جائے اور خصوصاً اپنے وطن بھٹکل بھی لے جانے کا انتظام کیا جائے جس کی وہ دلی خواہش رکھتے تھے لیکن افسوس کہ اس کا موقع نصیب نہیں ہوا اور حضرت شیخ ذی قعدہ کی انہیں تاریخوں میں اس دنیا سے رحلت فرما گئے، جن تاریخوں میں عموماً رابطہ کے جلسے ہوتے ہیں۔ اس طرح حضرت شیخ کی زیارت دوبارہ اس دنیا میں میسر نہیں آئی اور وہ داغ مفارقت دے گئے اب انشاء اللہ جنت میں حضرت سے ملاقات ہوگی باذن اللہ۔ اللہ تعالیٰ حضرت شیخ کی مغفرت فرما کر جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے اور ان کے متعلقین اور ہم سب کو صبر جمیل نصیب فرمائے۔ آمین

یہ چند سطور حضرت شیخ کے حالات میں محض اللہ تعالیٰ کی توفیق سے ناچیز نے قلم بند کی ہیں ورنہ ان کی زندگی ایک بحر زخار ہے اور ان کے جملہ اوصاف اور زندگی کے حالات ان مختصر صفحات میں بیان کرنا مشکل ہے۔ ع

سفینہ چاہئے اس بحر بےکراں کے لئے

فی الوقت اسی پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ آئندہ چل کر ممکن ہے کوئی تفصیلی کتاب ان کی مجاہدانہ زندگی پر حاوی آجائے اسکے لئے اللہ تعالیٰ سے اعانت و مدد درکار ہے۔

# انڈونیشیا میں "الاسلام الممتحن" کی صدائے بازگشت

قارئین کے علم میں ہو گا کہ سید محمد الحسنی ندوی مدیر البعث الاسلامی کی نئی کتاب "الاسلام الممتحن" (اسلام دور آزمائش میں) ایک سال کا عرصہ ہوا قاہرہ سے شائع ہوئی ہے، کتاب کا بہت گرمجوشی سے استقبال کیا گیا اور اب تک اس کے تین ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں، آخری ایڈیشن دس ہزار کی تعداد میں شائع ہوا اور قریب الختم ہے، خوشی کی بات ہے کہ مشرق بعید میں بھی کتاب کا بہت خیر مقدم ہوا، انڈونیشیا کے ایک مرد مجاہد اور دینی رہنما استاذ حسین الحبشی کے تازہ مکتوب سے جو مصنف کتاب کے نام انہوں نے حال میں ارسال کیا ہے اس کی کچھ تفصیلات معلوم ہوئی ہیں، کتاب کا انڈونیشی زبان میں ترجمہ بھی ہو رہا ہے۔

بے محل نہ ہو گا اگر ان کے خط سے پہلے استاذ حسین الحبشی کا بھی مختصر تعارف کرا دیا جائے۔ استاذ حسین ایک عرصہ تک انڈونیشیا کے جامعہ اسلامیہ میں کلیۃ اصول الدین کے استاد رہے اس کے بعد وہاں کی عصری یونیورسٹی میں پروفیسر ہوئے ۱۹۵۰ء میں سیاسی سرگرمیوں میں حصہ لینا شروع کیا اور انڈونیشیا کی مشہور اسلامی جماعت، ماشومی پارٹی کے سکریٹری جنرل کے عہدہ پر فائز ہوئے ڈاکٹر محمد ناصر اسکے صدر تھے، ماشومی پارٹی کے ترجمان PEMBINA کے عرصہ تک چیف ایڈیٹر بھی رہے، اس وقت وہ انڈونیشیا کی "مجلس اسلامی اعلیٰ" کے صدر اور ایک اشاعتی ادارہ کے سربراہ ہیں۔ ان کے مکتوب کا خلاصہ درج ذیل ہے۔ وہ لکھتے ہیں:-

"آپ کی بیش قیمت کتاب پہونچی، اس میں کوئی مبالغہ نہیں ہے کہ اس موضوع پر جو بہترین چیزیں لکھی گئی ہیں ان میں اس کا شمار ہے، اس کا اسلوب بھی دوسری بہت سی کتابوں سے سلیس و سہل ہے اور اس کا ترجمہ بھی انشاء اللہ آسان ہو گا، میں نے اس مرتبہ عید الاضحیٰ کا خطبہ اس کے بعض مضامین خاص طور پر "مقیاس الحضارۃ فی المجتمع الاسلامی" اور "ارادوھا جنّۃ فانقلبت جحیماً" سے استفادہ کر کے بلکہ اسی کی کچھ عبارتیں لے کر تیار کیا اور مختلف علاقوں میں اپنے اہل تعلق کے حوالہ کیا کہ اس مرتبہ وہ یہی خطبہ دیں، خود میں نے انڈونیشیا کے دوسرے دار السلطنت سورابایا میں مسجد المجاہدین کے وسیع میدان میں جہاں ایک لاکھ سے زائد نمازی جمع تھے یہ خطبہ دیا اور خدا کا شکر ہے کہ وہ بہت پسند کیا گیا اور سامعین نے اس کا بہت خوشگوار اثر قبول کیا۔ اللہ تعالیٰ کے فضل کے بعد اس تمام تاثر کا سبب اور واسطہ آپ ہیں۔

اللہ تعالیٰ آپ کو امت محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم اور اسلاف کی طرف سے اس کی بہترین جزا عطا فرمائے، کیا اچھا ہوتا کہ آپ اپنے وقت کا ایک حصہ تصنیف و تالیف کے لئے مخصوص رکھتے اور اس امت کو جو بہت پیاسی اور صحیح دینی رہنمائی کی ضرورت مند ہے حقائق دینی سے روشناس ہونے کا موقع ملتا۔

آج انڈونیشیا اور پورے عالم اسلام کو سیدنا الامام ابو الحسن علی الندوی اور ایسے حضرات کی شدید ضرورت ہے جو دین کا صحیح ذوق و مزاج رکھتے ہیں۔

طالب دعا

حسین الحبشی

۱۹ ذی الحجہ ۱۳۹۸ھ


تعمیر حیات لکھنؤ

پندرہ روزہ

شعبۂ تعمیر و ترقی دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ

جلد نمبر (۱۶) ۲۵ جنوری ۱۹۷۹ء – ۲۵ صفر المظفر ۱۳۹۹ھ شمارہ نمبر (۶)

شرح تعاون

اندرون ملک ——— ۱۶ روپئے

فی پرچہ ——— ۸۰ پیسے

بیرون ملک۔ بحری ڈاک جملہ ممالک ۴ پونڈ

ہوائی ڈاک

ایشیائی ممالک ۶ پونڈ

افریقی ممالک ۷ پونڈ

یوروپ و امریکہ ۹ پونڈ


اس دائرہ میں اگر سُرخ نشان ہے تو اس کا مطلب ہے کہ اس شمارہ پر آپ کا چندہ ختم ہو چکا ہے لہٰذا اگر آپ یہ چاہتے ہیں کہ یہ دین و ادب کا خادم، ندوۃ العلماء کا ترجمان، آپ کی خدمت میں پہنچتا رہے تو اس کا سالانہ چندہ مبلغ بارہ روپے ارسال فرمائیے، اگر اگلے شمارہ کی روانگی سے پہلے آپ کا چندہ یا خط موصول نہ ہوا تو سمجھ کر کہ آپ کو وی۔پی بھیجنے میں چندہ ادا کرنے میں سہولت ہے۔ اگلا پرچہ مع وی۔پی خرچ Rs. 15/25 کے مطالبہ میں وی۔پی سے روانہ ہو گا۔ چندہ یا خط بھیجتے وقت اپنا نمبر خریداری لکھنا نہ بھولیں۔

# ملّی قیادت کے لئے کم سے کم مطلوب معیار

الحق جلیس ندوی

ملّت اسلامیہ دنیا کی اور قوموں کی طرح ایک قوم نہیں بلکہ اس کی چند خصوصیات اور امتیازات ہیں۔ ع

خاص ہے ترکیب میں قوم رسولِ ہاشمی

اس امّت کے مزاج، نہاد، خمیر اور ضمیر میں دین، اخلاق، تعلق مع اللہ، خوفِ خدا اور فکرِ آخرت کو سمو دیا گیا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ ماحول کی خرابی، دنیا کی محبت، مادی وسائل کی کشش یا دشمنِ اسلام طاقتوں کی سازش اس ملت کے افراد اور معاشرہ کو اپنے اصل مقصدِ وجود اور ملی تشخص سے وقتی طور پر بیگانہ کر دے۔ لیکن ہر چیز جیسے اپنے اصل کی طرف لوٹتی ہے، اسی طرح اس ملّت کے افراد کو اس کے اصل جادہ و منزل کی طرف گامزن کرنے میں ذراسی کوشش کے حوصلہ افزا نتائج سامنے آتے ہیں، مسلم عوام اپنی تمام تر کمزوریوں کے باوجود دین سے محبت کرتے ہیں، اللہ اور رسولؐ کے نام پر ہر قربانی کے لئے تیار ہو جاتے ہیں، اسلام کا رشتہ ان میں حیرت انگیز عملی صلاحیت پیدا کر دیتا ہے، اس ملت کے عوام کی دین سے محبّت اور اسلام سے ان کے مخلصانہ اور والہانہ تعلق کا یہ پہلو جہاں قابل قدر اور لائق تحسین ہے، مگر اپنی ملّی قیادت کے سلسلے میں دینی معیار سے چشم پوشی، سادگی، بے شعوری اور لاپروائی پر دنیا کی حیرت بے جا نہیں۔

مسلمان ہر سطح پر اور زندگی کے ہر گوشہ میں چاہے وہ سیاست و حکومت، تعلیم اور اقتصادیات سے تعلق رکھتا ہو یا شہر، قصبہ اور محلّہ کی سربراہی، حتیٰ کہ کسی مسجد کی تولیت سے تعلق رکھتا ہو، خالص مادی نقطۂ نظر اور دنیوی وجاہت کو معیار بناتے ہیں، اس پیمانہ سے اپنے قائدین کا انتخاب کرتے ہیں، اور آنکھیں بند کئے انکے پیچھے چل پڑتے ہیں، اور اس موقع پر دین انکی نظر سے ایسا اوجھل ہو جاتا ہے کہ اپنی قیادت کے دینی احتساب، تدبر، بصیرت اور خلوص کے امتحان کی نہ انہیں فرصت ملتی ہے نہ ضرورت محسوس ہوتی ہے، جس ملّت کی تاریخ دین کی خاطر جاں نثاری سے مالامال ہو، جو شعائرِ دین کو عزیز رکھتی ہو، جو اسلامی شریعت کے نفاذ کے لئے کسی قسم کی قربانیوں سے دریغ نہ کرے، وہ ملت اپنی قیادت کے نازک مسئلہ میں ایسی بے شعوری کا ثبوت دے اور ایسے قائدین کا انتخاب کرے کہ جو کاروانِ ملت کا رخ مکہ کی بجائے ترکستان کی طرف کر دیں، اسکی کوئی تاویل اور توجیہ ناقابل فہم ہے۔ اس برصغیر کی سیاسی تاریخ میں یہ تکلیف دہ اوراق بھی ملتے ہیں کہ مسلمانوں نے مذہبی نعروں سے مسحور ہو کر ان لوگوں کو اپنا پیشوا بنایا جن کی عملی زندگی کو ان نعروں سے دور کا تعلق نہ تھا، اور ان مخلصین کو مسترد کیا جنکی دینداری اور دیانت داری، خلوص و خیرخواہی، تدبر اور بصیرت کی قسمیں کھائی جا سکتی تھیں ——— ملت اگر اپنی پستی کو سربلندی سے، زوال کو عروج سے، ذلت و ادبار کو عزت و وقار سے بدلنا چاہے تو اسے ہر سطح پر اور زندگی کے ہر گوشہ میں قیادت کے انتخاب کے سلسلے میں خدا اور رسول کے معیار کو سامنے رکھنا ہو گا۔ خدا نے "اعلون" (سربلندی) کو مشروط رکھا ہے، "ان کنتم مومنین" کے ساتھ ہر مسلمان یہ جانتا ہے کہ ایک مومن پر اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت پر ایمان کے بعد چند فرائض بھی عائد ہوتے ہیں، اس میں ایک فرض کے بارے میں ارشاد ہے کہ "نماز دین کا ستون ہے، جس نے اسے قائم کیا اس نے دین کو قائم کیا اور جس نے اسے ڈھایا گویا اس نے دین کو ڈھا دیا"۔

ایک فرض کے بارے میں ارشاد نبویؐ کو دیکھئے اور پھر ہماری ملی قیادت کا جائزہ لیجئے۔ ایک عام مسلمان اگر نماز سے غفلت کرتا ہے تو وہ دین کے انہدام میں گویا شریک ہے، "قوم رسول ہاشمی" کی قیادت کے منصب پر فائز حضرات اگر اس فرض سے تغافل برتتے ہیں تو اس کا اثر کتنا دوررس اور ہمہ گیر ہوتا ہو گا۔ اس کے مظاہر بھی ہماری قومی زندگی میں ہر قدم پر ہمیں نظر آ رہے ہیں، دین اور احکامِ دین سے بے نیاز قیادت کی ملک و ملت دشمنی کی تازہ مثال پڑوسی اسلامی مملکت کے سابق وزیر اعظم کے وہ کارنامے ہیں جن پر سے اب پردہ اٹھ رہا ہے، یہ تو ایک ملک کی بات ہے ورنہ روزمرہ زندگی میں شہر، قصبہ اور محلہ کی سطح پر نہ جانے کتنے نام نہاد مسلمان ہیں جو مسلمانوں کی لیڈری اور چودھراہٹ کا بیڑا اٹھا کر ملت کا بیڑہ غرق کرتے رہتے ہیں ——— آخر میں ہم گذارش کرتے ہیں مسلم عوام سے کہ خدارا اپنی کسی تنظیم، کسی انجمن، کسی سوسائٹی، کسی جماعت یا پارٹی، کسی ادارے، انسٹی ٹیوشن اور ملک کی زمام کو ان افراد کے ہاتھوں میں نہ دیجئے جن میں مسلمان ہونے کی کم سے کم کوالیفکیشن تک نہ ہو، جو نماز، روزہ، حج و زکوٰۃ سے غافل، معروف و منکر کے حدود سے ناآشنا، اسلامی تعلیمات کے بنیادی تقاضوں سے بے نیاز ہوں، وہ لوگ تو مسلم سوسائٹی میں سربراہی کا مقام تو کیا بار پانے کے تک مستحق نہیں جو دین اور شعائرِ دین کی بے حرمتی کے مرتکب ہوں اور انہیں طنز و استہزا کا نشانہ بناتے ہوں، یقین کیجئے قرآن و سنت اور تاریخ کے ریکارڈ میں تلاش کیجئے، رات دن کے تجربات اور ذاتی مشاہدات میں ٹٹولئے کہ ایسے افراد کے ہاتھوں ملت کو کبھی کوئی نفع، کوئی خیر و فلاح نصیب نہیں ہوئی؟ کسی مسلم پرائمری اسکول کی انتظامیہ سے لیکر حکومت و سیاست کے اعلیٰ سے اعلیٰ مقام تک ان افراد کے ہاتھوں ملت کو جو زک اٹھانی پڑی، جن ناقابل تلافی نقصانات سے گذرنا پڑا وہ ایسی شفاف اور عیاں حقیقت ہے جو محتاج دلیل و تشریح نہیں۔

ہم درخواست کرتے ہیں، ملت کے مختلف طبقوں سے تعلق رکھنے والے رہنماؤں سے یا قیادت کے طالب حضرات سے کہ یہ وہ مقام ہے جو سب سے پہلے اپنی زندگی کو احکام الٰہی کا پابند بنانے کی دعوت دیتا ہے، جس ملت کی چارہ سازی اور رہنمائی کے لئے آپ نکلے ہیں وہ اسی وقت آپ کی رہنمائی میں ساحل مراد تک پہونچ سکتی ہے جب آپ کی زندگی ایک سچے مومن کی زندگی کا نمونہ ہو۔ روز حشر اور کسی چیز کی پرسش ہو یا نہ ہو لیکن احکام الٰہی کی پابندی کی پرسش ہر حال ہو گی، اسلئے ہمیشہ پیش نظر رہے کہ ع "مومن فقط احکام الٰہی کا ہے پابند" ——— اور اس ارشاد کو فراموش نہ کیجئے کہ العزۃ للّٰہ ولرسولہ وللمومنین اور ان اکرمکم عند اللہ اتقاکم۔

# "اس دنیا میں دو راستے ہیں، ایک راستہ ہے محبّت، خلوص، اعتماد اور بے غرضی کا۔ اور دوسرا راستہ ہے نفرت، انتقام، بدگمانی اور خود غرضی کا۔ ان دونوں راستوں کے ریکارڈ اور ان پر چلنے والوں کے نتائج ہمارے سامنے ہیں۔"

## "ہمارا اور ہر مذہب پر یقین رکھنے والے کا یقین ہے کہ خدا کو جو چیز سب سے زیادہ ناپسند ہے وہ ظلم ہے۔"

## "اہلِ مراد آباد مبارکباد کے مستحق ہیں۔"

● ——— مولانا ندوی

(تحریک "پیام انسانیت" سے قارئین تعمیر حیات اچھی طرح واقف ہیں۔ مدرسہ عربیہ امدادیہ مراد آباد کی دعوت پر حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی دامت برکاتہم، مولانا اسحٰق جلیس صاحب ندوی (مدیر تعمیر حیات) کے ساتھ ۱، ۲، ۳ دسمبر کو حسب پروگرام مراد آباد تشریف لائے۔ شہر کے مختلف مقامات پر پیام انسانیت کے چار پروگرام ہوئے۔ ایک پروگرام ۲ دسمبر کو بعد نماز عشاء مدرسہ امدادیہ میں رکھا گیا۔ غیر مسلم بھائی بھی اس کے اندر کافی تعداد میں شریک ہوئے اور اچھے اثرات لیکر گئے۔

حضرت مولانا دامت برکاتہ، کی تقریر سے قبل جناب مولانا باقر حسین صاحب (مدظلہ العالی) مہتمم مدرسہ عربیہ امدادیہ نے ایک مختصر تقریر فرمائی۔ اس کے اندر مدرسہ امدادیہ کی تاریخ، حضرت مولانا دامت برکاتہ، کی خدمات اور مقام پر روشنی ڈالی۔ ان کی تقریر کے بعد مولانا اسحٰق جلیس صاحب ندوی مدیر تعمیر حیات نے بڑے سلیس وشستہ اور اچھے انداز میں پیام انسانیت کی اہمیت و ضرورت پر روشنی ڈالی موصوف کی تقریر بڑی جامع اور مکمل تھی۔ افسوس کہ وہ ٹیپ نہ ہو سکی۔

مولانا دامت برکاتہ، کی تقریر کو مولوی محمد اسعد صاحب قاسمی نے ٹیپ کیا تھا۔ مولانا ظہیر انوار صاحب مدرس مدرسہ امدادیہ مراد آباد کے تعاون سے ہم نے وہ تقریر نوٹ کی اور اسے مرتب کر کے قارئین "تعمیر حیات" کی خدمت میں پیش کرنے کی سعادت حاصل کر رہے ہیں)

عتیق احمد قاسمی

خادم تدریس مدرسہ امدادیہ مراد آباد (یوپی)

### بہت بڑا امتحان:

بزرگو اور دوستو! اچھی بات یہ ہے کہ کوئی سچی بات اچھی طرح کہہ دی جائے پھر کوئی مشاعرہ نہیں کہ اس کے بعد غزل ضرور پڑھی جائے محنت سے غزل لکھی ہے، ایک شاعر دور سے آئے ہیں فیس بھی ملے گی، اگر غزل نہیں پڑھیں گے تو فیس نہیں ملے گی۔ اس لئے کوئی اچھی سے اچھی کسی بڑے استاد کی غزل بھی ہو تو اس کے بعد غزل پڑھنا ضروری ہے۔

میرے دل میں کئی بار یہ بات آئی کہ میں چپکے سے یہاں سے چلا جاؤں اور اس کی بھی ایک نظیر قائم کر دوں، ایک مثال قائم کر دوں کہ ہم میں جو خدا کا بندہ بھی کوئی بات اچھے طریقے سے کہہ دے اور وہ بات دل میں اتر جائے اور اطمینان ہو جائے کہ جو ڈوز Dose دینا چاہئے تھا وہ ڈوز Dose دیدیا گیا تو پھر اس کے بعد ضرورت نہیں کہ تقریر کا سلسلہ ضرور جاری رہے۔ لیکن میرا نام اتنا لیا گیا شروع سے، اور مجھے ایک طرح کی شکایت ہے اپنے قابل احترام دوست مولانا باقر حسین صاحب سے کہ وہ جب تک تقریر کرتے رہے مجھ پہ ایک رنگ آتا تھا ایک رنگ جاتا تھا۔

سچی بات یہ ہے کہ انسان ہزار بے حیا ہو جائے لیکن جب وہ اپنی تعریف مبالغہ کے ساتھ سنتا ہے تو آخر کچھ تو اس کو شرم آنی چاہیئے۔ میرے لئے بڑی مشکل یہ تھی کہ میں ان کے گھر ٹھہرا ہوں، مدرسہ میں آیا ہوں تو میں ان کو کیسے روک دیتا، میں چاہتا تھا کہ کوئی ایسا اشارہ ان کو مل جائے جس سے وہ میرے لئے اتنا بڑا امتحان پیدا نہ کریں۔ انہوں نے (میں ان کے خلوص پر شبہ نہیں کرتا) میرے متعلق اتنا کہا اتنا کہا کہ میرے لئے جلسہ سے اٹھ کر چلا جانا مشکل ہو گیا ورنہ سچی بات یہ ہے کہ میرے لئے اتنی دیر تک اپنی ذات کے متعلق سننا بہت بڑا امتحان تھا اور سب کے لئے ہونا چاہیئے۔

میں یہ تصوف کے سلسلے کی کوئی بات نہیں کہہ رہا ہوں بلکہ انسانیت کی بات کہہ رہا ہوں۔ فارسی کی مثل ہے ایاز قدر خود را بشناس (ایاز اپنی قدر و قیمت خود پہچان لو) ہر آدمی اپنی زندگی سے اپنی خامیوں سے واقف ہے، دوسرا واقف ہو نہ ہو لیکن وہ تو جانتا ہے۔ اس لئے میرے لئے ایک بڑا امتحان یہ تھا کہ میرے متعلق اتنی لمبی چوڑی بات کہی گئی لیکن اس سے میں نے یہ فائدہ اٹھایا کہ آئندہ ہمارے پیام انسانیت کے جلسوں میں یہ سلسلہ یا تو بالکل ختم کرا دیا جائے گا، میں اس کی اجازت نہیں دوں گا یا بقدر ضرورت بتا دیا جائے۔

### کھِلا ہوا چمن:

آپ حضرات بہت سے باغوں میں گئے ہوں گے، پہلے شہروں میں کمپنی باغوں کا رواج تھا اور یوں بھی لوگوں کے یہاں اپنے ذاتی باغ بھی ہوتے تھے۔ آپ نے چمن کھلا ہوا دیکھا ہوگا، آپ خوش ہوئے ہوں گے کیونکہ پیدا کرنے والے اللہ تعالیٰ نے سب کو خوبصورتی سے فائدہ اٹھانے کا ایک مادہ دیا ہے لیکن جب میں اس چمن کو دیکھتا ہوں جو اس وقت میرے سامنے کھلا ہوا ہے، میں آپ کے کپڑوں کی ورائٹی کو نہیں کہہ رہا ہوں، یہ تو بہت معمولی درجہ کی بات ہے، لیکن جن جن طبقوں سے آپ کا تعلق ہے، جن جن مذاہب اور مکاتب خیال سے آپ کا تعلق ہے، ان کو جب میں دیکھتا ہوں کہ ایک بہار ہے، میرے سامنے پھولوں کا ایک گلدستہ ہے جس میں ہر رنگ کے ہیں، تو میرا دل باغ باغ ہوتا ہے، اور مجھے اس باغ کا کھلنا اور اتنے پھولوں کا ایک ساتھ ہونا یہ بھی بھاتا ہے، خوش کرتا ہے اور ان پھولوں کے رنگ کا جو اختلاف ہے یہ بھی مجھے خوش کر رہا ہے میں اس کو بھی باغ کی ایک بہت بڑی خوبی سمجھتا ہوں کہ پھول بھی ہوں اور پھول مختلف رنگ اور خوشبوؤں کے ہوں۔ ذوق نے کہا تھا ؎

گلہائے رنگ رنگ سے ہے زینتِ چمن
اے ذوق اس چمن کو ہے زیب اختلاف سے

میں اپنے سامنے انسانی باغ کھلا ہوا دیکھتا ہوں، یہ چمن اپنے سامنے دیکھتا ہوں تو میرا



دل باغ باغ ہو جاتا ہے اور میں اس ملک کے متعلق مایوس نہیں ہوتا اور مجھے بڑی طاقت حاصل ہوتی ہے۔ اگر آپ ایک آواز پر ایک ایسے آدمی کے نام پر جس سے آپ واقف نہیں، وہ آپ کے شہر کا نہیں، اس کا کوئی تجربہ نہیں محض بھروسہ پر اور ایک انسان کے اندر دوسرے انسان کے ساتھ اچھا خیال قائم کرنے کی جو طاقت ہے اس کی بنا پر آپ سرد موسم میں آجاتے ہیں۔ اگر اس ملک میں اتنی بات بھی ہے تو اس ملک سے مایوس ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔ یہ بات بھی جس دن ختم ہو جائے کہ بلانے پر بھی آپ نہ آئیں جب تک کہ اس کے ساتھ کوئی مادی یا سیاسی فائدہ نہ ہو، اگر ملک کی یہ حالت ہو گئی (خدا نہ کرے، ہماری زندگی میں تو نہ ہو) تو پھر اس ملک سے مایوسی ہے۔ لیکن جب تک یہ بات نہیں ہے، اور اتنے بھائی، اتنے بڑے بھائی، اتنے مصروف بھائی، اتنے سمجھدار بھائی ایک آواز پر جمع ہو جائیں، عربی مدرسہ میں (یہاں ہمارے غیر مسلم بھائی اور دوست بھی ہیں) محض اس خیال سے کہ کوئی اچھی بات کہی جائے گی ہمارے ایک مہمان آئے ہیں ان کی بات سنی جائے گی، اس وقت تک اس ملک کے مستقبل کو تاریک نہیں کہا جا سکتا۔ یہ بات حوصلہ پیدا کرتی ہے اور اطمینان دلاتی ہے۔

### دو راستے:

میرے بھائیو! بات بہت ہو چکی اور رات بہت ہو چکی، اور آپ بہت دیر سے بیٹھے ہوئے ہیں آپ کے سامنے مختصر طور پر یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ اس دنیا میں دو راستے ہیں۔ ایک راستہ ہے محبت کا، خلوص کا، اعتماد کا، بے غرضی کا اور ایک راستہ ہے نفرت کا، انتقام کا، بدگمانی اور خود غرضی کا۔ یہ دونوں راستے کوئی نئے نہیں ہیں۔ لاکھوں برس سے یہ دنیا قائم ہے یہ دونوں راستے آزمائے جا رہے ہیں۔ ان دونوں راستوں کے ریکارڈس، ان دونوں راستوں پر چلنے کے نتیجے بھی ہمارے سامنے ہیں۔ تاریخ ان کا بہترین ریکارڈ ہے لیکن افسوس ہے کہ دوسرے راستے کا ریکارڈ اتنا محفوظ نہیں ہے۔

ہماری تاریخیں بادشاہوں کی تاریخیں ہیں، طاقتوروں اور حکمرانوں کی تاریخیں ہیں، ان لوگوں کی تاریخیں ہیں جو آندھی پانی کی طرح اٹھے اور پوری دنیا میں پھیل گئے، یہاں سے وہاں کبڈی کھیلتے ہوئے گئے، کھیتوں کو جلاتے ہوئے، جنہوں کو بے چراغ بناتے ہوئے اور دکانوں اور تمدنوں کے ملبے بناتے ہوئے، وہ ایک جگہ سے دوسری جگہ گذر گئے۔ ان کی تاریخ آج دنیا میں بہت محفوظ ہے۔ آپ کسی بادشاہ کے حالات تلاش کریں تو مل جائیں گے اور ایسی تفصیل سے ملیں گے کہ ان کا اٹھنا بیٹھنا، کھانا پینا سب مل جائے گا۔ لیکن اہلِ دل کی باتیں، اہلِ محبت کی باتیں، خلوص والوں کی باتیں بہت کم محفوظ کی گئی ہیں۔ ان کا ریکارڈ بہت تھوڑا ہے لیکن ہے ایسا نہیں ہے کہ بالکل ناپید ہو۔

اب آپ دونوں راستوں کو دیکھ لیجئے دوسرے راستے پر چلنے والوں کو اس کے نتیجے میں کیا ملا؟ اس کے نتیجے میں ان کو نفاق ملا، سازشیں ملیں، گالیاں ملیں، ایک غیر مختتم لڑائی ملی۔ یہ اس کی تاک میں جس کا بس چلے، جس کی بازی لگ جائے۔ بادشاہوں کا یہ حال تھا ان سے بڑھ کر طاقت کس کے پاس تھی۔ تلوار کی طاقت ان کے پاس، فوج کی طاقت ان کے پاس، دولت کی طاقت ان کے پاس، عہدوں کی طاقت ان کے پاس، لیکن رات کو میٹھی نیند نہیں سو سکتے تھے۔ آپ یقین مانئے کہ شاید ہی کوئی خدا کا بندہ ایسا رہا ہو جو لمبی تان کر میٹھی نیند سوتا ہو، پاؤں پھیلا کر، بے فکر ہو کر۔ گھر والوں سے وہ ڈرتا تھا، اپنے بچوں سے وہ ڈرتا تھا اپنے عزیزوں سے وہ ڈرتا تھا، اپنے وفاداروں سے وہ ڈرتا تھا، اپنے عہدہ داروں سے وہ ڈرتا تھا غریبوں سے وہ ڈرتا تھا امیروں سے وہ ڈرتا تھا۔ ہر ایک کو بدگمانی سے دیکھنا، ہر ایک کو شک کے ساتھ دیکھنا، یہ کیا مصیبت ہے؟ آپ مجھے شک کے ساتھ دیکھیں میں آپ کو شک کے ساتھ دیکھوں، لعنت ہے ایسی زندگی پر، زندگی کا مزا کیا؟ باپ کو بیٹے پر بھروسہ نہ ہو بیٹے کو باپ پر بھروسہ نہ ہو۔

میں ملکوں کا نام نہیں لیتا اس لئے کہ میں سیاسی آدمی نہیں ہوں لیکن دنیا کے کئی ملک ایسے ہیں جہاں کسی کو کسی پر بھروسہ نہیں۔ اور یہ کہتے ہیں "دیوار ہم گوش دارد" فارسی کی پرانی مثل تھی لیکن کبھی اس کی ایسی تصویر سامنے نہیں آئی جیسی آج سامنے آئی ہے۔ بھائی بھائی سے دل کی بات نہیں کہہ سکتا۔ آدمی بات کرتا ہے تو چاروں طرف دیکھتا ہے کہ کوئی سن تو نہیں رہا ہے بچے تو نہیں سن رہے ہیں اور پھر اس کے بعد بھی اس کی بات سن لی جاتی ہے۔ لوگ گھڑیاں لگائے ہیں وہ ریکارڈ کرتی ہیں۔

آپ دیکھئے حکومتوں میں جو انقلاب آتے ہیں اور اب بھی آرہے ہیں، آج بھی کتنے ملکوں میں رات کو سوئے تو کچھ حالت تھی اور صبح اٹھے تو کچھ نہیں، معلوم ہوا کہ تختہ الٹ گیا، فلاں جمہوریت کا تختہ الٹ گیا۔ فلاں حکومت کا تختہ الٹ گیا، یا فلاں پارٹی کا تختہ الٹ گیا، الیکشن کے راستے سے بھی یہی ہو رہا ہے۔ ایک پارٹی دوسری پارٹی کو برداشت نہیں کر سکتی اور ایک آدمی دوسرے کو برداشت نہیں کر سکتا۔ دنیا کیمپوں میں بٹی ہوئی، پہلوان اکھاڑے میں اترے ہوئے، بھائی زندگی کیا اسی پہلوانی کا نام ہے کشتی لڑنے کا نام ہے، پوری زندگی اسی کشمکش میں گذرے گی؟

ابھی ایک سال چند مہینے ہوئے کہ میں امریکہ کے سفر پر تھا واشنگٹن میں میرا ایک پروگرام رکھا گیا وہاں کے اسلامک سنٹر میں۔ سچی بات یہ ہے کہ میرے دل میں ایک بخار تھا جیسا کہ دل میں بخار ہوتا ہے کہ خدا وہاں پہنچائے جہاں میں اپنے دل کی بات کہہ سکوں اور جو اونچے سے اونچا ایوان ہے وہاں تک میری بات پہونچ سکے، میں جانتا تھا کہ صدر امریکہ میری بات نہیں سن رہے ہیں۔ ان کو کہاں فرصت؟ میری یہ حیثیت کہاں؟ مجھے تو اپنے دل کا بخار نکالنا تھا وہ تقریر ریکارڈ ہے انگریزی میں آگئی ہے اور اردو میں بھی آگئی ہے میں نے وہاں کہا،

### خلوص سے خالی، خود غرضی پر مبنی:

میں وہائٹ ہاؤس (White House) کی دیوار کے نیچے بیٹھ کر اس وقت کہہ رہا ہوں اور خدا کا شکر ادا کرتا ہوں کہ خدا نے مجھے یہاں تک پہنچایا۔ میں اپنا فرض سمجھتا ہوں کہ یہ کہوں (کوئی سنے یا نہ سنے) کہ امریکہ جو دنیا کے کتنے ملکوں کو کھلاتا ہے پیٹ بھرتا ہے، اسلحہ الگ دیتا ہے، دشمن سے الگ حفاظت کرتا ہے اس کا کوئی حقیقی دوست نہیں، اس لئے کہ اس کے اندر خلوص نہیں، جو کچھ کرتا ہے خدا کے لئے نہیں کرتا ہے وہ اس لئے نہیں کرتا کہ مظلوموں کا ساتھ دے، اس لئے نہیں کرتا کہ ظالم کا ہاتھ پکڑے، اس لئے نہیں کرتا کہ اس کا اخلاقی فرض ہے، اس لئے نہیں کرتا کہ اس کا کچھ ثواب ملے گا وہ اس لئے نہیں کرتا کہ شریعت کا تقاضا ہے، مردانگی کا تقاضا ہے، طاقت کا یہ ٹیکس ہے، بلکہ وہ اس لئے کرتا ہے، اس لئے کھلاتا ہے، اس لئے روپے پیسے کی ریل پیل کرتا ہے تاکہ اقوام متحدہ میں وہ قومیں اس کو ووٹ دیں۔ اس کا ساتھ دیں، اس کے حریف روس کے حملے سے اس کو بچائیں، دنیا میں اس کی جو بالادستی ہے وہ قائم رہے۔ میں نے کہا کان کھول کر امریکہ سن لے کہ اس کا کوئی جگری دوست نہیں، کوئی اس کا مخلص دوست نہیں۔ کسی دل میں اس کے لئے مخلصانہ جذبہ یعنی سچی محبت نہیں وہ عرب ہوں یا عرب کے باہر کی دنیا ہو وہ مشرق وسطیٰ کے ممالک ہوں یا مشرق بعید کے ممالک ہوں، یہ سب دھوکہ دیتے ہیں، سب آپ سے لیتے ہیں، مجلسوں میں ان کی باتیں سنئے تو باتیں امریکہ کو سناتے ہیں۔

میں نے کہا، یہ کس کا نتیجہ ہے؟ یہ اس بات کا نتیجہ ہے کہ خلوص سے خالی ہے اور خود غرضی پر مبنی ہے۔ خود غرضی کی قسمیں ہیں۔ ایک معمولی بے پڑھے لکھے جاہل آدمی کی خود غرضی ہے۔ جس حیثیت کا وہ ہے ویسی اس کی خود غرضی ہے لیکن ایک سیاسی لیڈر کی خود غرضی ہے، ایک سیاسی پارٹی کی خود غرضی ہے ایک

جمہوریت کی خود غرضی ہے، ایک دنیا کی بڑی طاقت کی خود غرضی ہے، وہ اس کی سطح کی ہوگی۔ لیکن خود غرضی خود غرضی میں کوئی فرق نہیں، وہ بھی خود غرضی یہ بھی خود غرضی۔

## خلوص کی جنتری چل رہی ہے:

حضرت عیسیٰؑ نے دو ہزار برس پہلے خلوص کے ساتھ جو انسانوں کے ساتھ ہمدردی کی تھی، آج انہیں کی جنتری چل رہی ہے، آج انہیں کا نام لیا جا رہا ہے۔ خدا کے پیغمبروں نے حضرت آدم سے لے کر نوحؑ، ابراہیمؑ سے لے کر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک، انہوں نے بے غرض دنیا کی خدمت کی۔ انہوں نے دنیا کو محبت کا پیام دیا۔ انہوں نے دنیا کو دیا اور لیا کچھ نہیں۔ اس کا نتیجہ ہے کہ سیکڑوں ہزاروں سال گذر جانے کے بعد بھی ان کا نام زندہ ہے ان کا کام زندہ ہے۔ لوگوں کے دل میں ان کی محبت ہے۔ خواہ کوئی ان کے پورے راستے پر نہ چلے لیکن عظمت کے ساتھ، عزت کے ساتھ ان کا نام لیتا ہے۔ اس لئے کہ ان کا کام بالکل بے غرض تھا۔

تو ایک راستہ تو ہے بادشاہوں کا، سیاست دانوں کا، حکمرانوں کا، طاقت رکھنے والوں کا اور خود غرض لیڈروں کا۔

اور دوسرا راستہ محبت، پریم، معاف کردینے کا راستہ، بے غرضی اور خلوص کا راستہ، آپ دیکھ رہے ہیں کہ سورج کی طرح وہ چمک رہے ہیں اور اس میں کوئی فرق نہیں ہے زمانہ کے انقلاب۔ زمانہ کتنا بدل گیا، کتنا آگے بڑھ گیا۔ لیکن ابھی تک اسی طرح سے ان کا ستارۂ اقبال بلند ہے اور ان کی عزت، شہرت، مقبولیت کا سورج اسی طرح سے درخشاں ہے۔ ایک راستہ تو یہ ہے کہ برائی کا جواب برائی سے دیجئے، نفرت کا جواب نفرت سے دیجئے اور ایک راستہ یہ ہے کہ نفرت کا جواب بھی آپ محبت سے دیجئے۔ پہلا راستہ سیاسی لوگوں کا اور مادہ پرستوں کا ہے۔ پہلا راستہ طاقت پر ایمان و عقیدہ رکھنے والوں کا ہے اور دوسرا راستہ خدا کے پیغمبروں اور ان کے جانشینوں کا ہے۔

## جو دشمنی کرے اس سے دوستی کر:

اسی ہمارے ہندوستان کے ایک بڑے بزرگ صوفی حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء کا فقرہ میں نے ایک کتاب میں پڑھا انہوں نے کہا کہ لوگوں کا کہنا ہے،

"سیدھے کے ساتھ سیدھا اور ٹیڑھے کے ساتھ ٹیڑھا" لیکن میں کہتا ہوں کہ سیدھے کے سیدھا اور ٹیڑھے کے ساتھ بھی سیدھا"

انہوں نے اس کی مثال دی کہ کانٹے ہوں تو اگر تم اس کے اوپر کانٹا ڈالو تو کانٹے ہی کانٹے ہوتے چلے جائیں گے، کانٹوں کا ڈھیر ہو جائیگا، نہیں کانٹوں کے مقابلہ میں پھول۔ چنانچہ ان لوگوں کا طریقہ تھا کہ جن لوگوں نے ان کو تکلیف پہونچائی، جن لوگوں نے ان کو ذلیل کرنے کی کوشش کی، ان کے پیچھے پڑے رہے، ان کے ساتھ انہوں نے ایسی ہمدردی کی، محبت کی کہ معلوم ہوتا ہے کہ اصل محسن یہی تھے۔ بلکہ بعض لوگوں کو جو کمزور دماغ کمزور عقیدے کے ہیں ان کو خیال ہوتا تھا کہ بھائی دشمنی میں فائدہ ہے ایسے لوگوں کے ساتھ دشمنی کرنی چاہئے، اس میں زیادہ فائدہ ہے۔ دشمن زیادہ نوازا جاتا ہے۔ محسنوں کو یہ بھول جاتے ہیں، اپنوں کو یہ بھول جاتے ہیں۔ جب نفع پہنچانے کا وقت آتا ہے تو دوسروں کو یاد کرتے ہیں۔

ایک بزرگ کے میں نے شعر پڑھے وہ کہتے ہیں، اے خدا جو ہمارے راستے میں کانٹا ڈالے تو اس کی عمر کی باغ میں پھول ہی کھلا تا رہ۔ اس کے باغِ عمر میں جو پھول کھلے وہ سدا بہار رہے اور جو ہمارے ساتھ دشمنی کرے تو اس کے ساتھ ہمیشہ دوستی کر اور کبھی اس کا بال بیکا نہ ہو۔ اور راتوں کو اٹھ اٹھ کر دشمنوں کے لئے دعائیں کرتے تھے۔ دشمنوں کے لئے ان کی دعاؤں کا جتنا حصہ وقف تھا مجھے شبہ ہے کہ دوستوں اور ماننے والوں کے لئے اتنا ہی حصہ تھا یا اس سے کم تھا۔

## بادشاہوں نے گردنیں جھکوالیں لیکن دل جھکانے میں کامیاب نہیں ہوئے:

بادشاہوں نے ملک فتح کئے اپنے لئے گردنیں جھکوالیں لیکن انکے سامنے دل نہیں جھکے ایک دل کے بھی جھکانے پر وہ کامیاب نہیں ہوئے اگر کہا جائے کہ پورے پورے ملک میں، ایک دل بھی ان کے سامنے جھکا ہوا نہیں تھا ان کے لئے دعا کرنے والا نہیں تھا تو شاید غلط نہیں ہوگا اور آج یہ زمانہ شخصی سلطنتوں کا نہیں ایک دو چراغ جل رہے ہیں ٹمٹماتے ہوئے وہ بھی نہیں معلوم کہ کتنے دن کی ان کی زندگی ہے آج سیاست کا دور ہے، آج جمہوریت کا دور ہے، آج سیاسی پارٹیوں کا دور ہے۔ کیا آپ کہہ سکتے ہیں کہ ان سیاسی پارٹیوں کے لئے ان کے لیڈروں کے لئے ہمارے دل میں وہ محبت ہے وہ اعتماد اور بھروسہ ہے ہم ان کے لئے جان قربان کرنا، جان تو بڑی چیز ہے ہم ان کے لئے کسی ایک مفاد کو قربان کرنے کے لئے تیار نہیں، سب تجارت ہے سوداگری ہے، سوداگری کے سوا کچھ نہیں کہ ہمیں ووٹ دو اور ہم تمہارا کام کریں، نہ وہ ووٹ خلوص سے ہے اور نہ ان کا کام خلوص سے ہے۔

اور وہاں تو حال یہ تھا کہ پلکوں سے لوگ ان کی جگہ جھاڑتے، ان کے لئے رات رات بھر کھڑے ہو کر پہرہ دیتے اور جاگتے کہ ان کو تکلیف نہ ہو شاید یہ پانی مانگ لیں، شاید ان کی آنکھ کھلے، آپ دیکھئے لوگوں کو بزرگوں کے ساتھ صوفیائے کرام کے ساتھ سنتوں اور فقیروں کے ساتھ کیسا خلوص ہے،

ایک راستہ تو ہے خود غرضی کا، مفاد پرستی کا اور سوداگری کا، دینے لینے کا، تم ہمیں یہ دو ہم تمہیں اس کے بدلے میں یہ دیں گے وہ راستہ آپ آزما رہے ہیں۔ خلوص ناپید ہوتا چلا جا رہا ہے۔ کسی کو کسی کے ساتھ خلوص نہیں، اس لئے کہ خلوص کا تعلق دل سے ہے اور دل سے ہم کام نہیں لے رہے ہیں، سارا کام ہم دماغ سے لے رہے ہیں اور خلوص دماغ کی چیز نہیں بلکہ دل اور روح کی چیز ہے اور دل میں یہ چراغ بجھ گیا۔ یہ چراغ آندھیوں سے کب کا بجھ چکا ہے، اس جوت کو جلانے والا اب کوئی نہیں رہا۔

یہ خدا کے فقیر بندے، جو صوفی کہلاتے تھے، سنت کہلاتے تھے یہ کسی احسان کے کسی مدد کے کبھی امیدوار نہیں رہتے تھے یہ ان کا کام تھا۔ جو ان کے پاس آیا وہی جوت انہوں نے جلا دی، وہی شعلہ انہوں نے بھڑکا دیا، ان کے اندر خلوص پیدا کر دیا۔ ان کی دکانیں خلوص کی دکانیں تھیں، وہاں خلوص کا سودا ملتا تھا، کہنے والے نے کہا ہے ؎

وہ جو بیچتے تھے دوائے دل وہ دکان اپنی بڑھا گئے

**آج کہاں وہ دکان ہے جہاں وہ دوائے دل ملتی ہے؟ اور جس ملک میں، جس دنیا میں سب کچھ ملتا ہو، ہر سودا ملتا ہو لیکن دوائے دل نہ ملتی ہو وہاں کی زندگی میں کیا لطف ہے؟ میرے بھائیو! آپ زندگی کا لطف اٹھانا سیکھئے۔ ہم نے اتنی زندگی گذار دی لیکن زندگی کا حقیقی لطف نہیں اٹھایا۔**

## یہ ملک دوسرے ممالک کی رہنمائی کرسکتا ہے:

میرے بھائیو! اس ملک میں اللہ نے سب کچھ دیا ہے، اتنا لمبا چوڑا ملک جیسا بتایا میرے بھائی نے ۶۵ کروڑ کی آبادی، اور ملک بھی اتنا لمبا چوڑا، اس میں خدا کی دی ہوئی ہر نعمت موجود ہے۔ اگر ہم میں سلیقہ ہو تو کسی چیز کے لئے باہر جانے کی ضرورت نہیں۔ ہم دوسروں کو کھلا سکتے ہیں لیکن جو چیز کم ہوتی جا رہی ہے وہ آپس کی محبت ہے اور ایک دوسرے پر بھروسہ کرنا مل کر زندگی گزارنے کا سلیقہ، ساتھ رہ کر زندگی گزارنے کا سلیقہ، بھائی بھائی کی طرح، شہری شہری کی طرح، ایک خاندان، کنبے کے ممبر اور اس کے فرد کی حیثیت سے یہ ہم بھول گئے ہیں۔ اس ملک میں اسی کی ضرورت ہے۔ اگر یہ چیز اس ملک میں آجائے تو آج نہ صرف یہ کہ یہ ملک منزل پر پہونچ سکتا ہے بلکہ دوسرے ملکوں کی رہنمائی بھی کرسکتا ہے۔

بڑی خوشی کی بات ہے کہ میں نے مرادآباد آکر یہ چیز دیکھی۔ میں سمجھتا ہوں کہ مرادآباد کا تجربہ بڑا ہمت افزا ہے۔ یہ مرادآباد کی خوش قسمتی ہے اور ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے شہیدوں کی روح کی برکت ہے جن کا ذکر آپ نے سنا۔ میں اتنی صورتوں کو دیکھ رہا ہوں اس موسم میں، ایسے تھوڑے سے اعلان پر،

میں سمجھتا ہوں کہ مرادآباد اگر اس کام کو لے کر کھڑا ہو اور ہندوستان میں یہاں سے یہ پیغام پہونچے تو ہمیں امید ہے کہ ہندوستان اس وقت تباہی و بربادی کے جس غار کی طرف جا رہا ہے (جس کا بھیانک نقشہ کھینچا ہے ہمارے عزیز مولوی اسحٰق جلیس صاحب نے) اس سے بچ جائے گا۔ آج حالت یہ ہے کہ کوئی کام کرنے کو تیار نہیں، کسی کے اندر کام کرنے کی امنگ نہیں کسی کے اندر خدمت کا کوئی جذبہ نہیں، کسی کے اندر ہمدردی کا کوئی مادہ نہیں میں نے بعض جلسوں میں کہا کہ دفتر میں جو آدمی بیٹھا ہوا ہے وہ ایسا ہے جیسے بلی چوہے کے انتظار میں ہو اور جہاں کوئی اسامی کوئی کام کرانے والا پھنسا، اس نے اپنے ساتھی سے کہا کہ آیا ایک موٹا شکار، آئی ایک موٹی اسامی۔ سیوان کے جلسے میں میں نے کہا کہ اس شخص کو تو اٹھ کر، چند قدم چل کر آگے آنا چاہئے تھا کہ تم تو فرشتۂ رحمت ہو۔ تم کو تو خدا نے بھیجا، میں کس کام کے لئے بیٹھا ہوا تھا؟ کس بات کی تنخواہ پاتا ہوں۔ میں تو اسی لئے بیٹھا ہوا تھا کہ کوئی مجھ سے کام لے۔ تم تو میرے دل کی دوا ہو۔ تمہاری خدمت کے لئے میں نے پڑھا۔ اسکول میں پڑھا، کالج میں پڑھا، یونیورسٹی میں پڑھا، ڈگریاں حاصل کیں تاکہ میں تمہاری کچھ سیوا کروں، اگر تم نہیں تو میں بیکار ہوں۔

**آج دو چیزیں زندہ ہیں ایک پیسہ کی محبت اور وقعت اور ایک نفرت فرقہ وارانہ منافرت اخلاق، انسانیت، شرافت، جذبۂ خدمت، ہمدردی سب چیزیں مرچکی ہیں۔**

یہ کسی ملک کے لئے کوئی اچھی تصویر نہیں ہے بس بھائیو بہت وقت لیا اور جو بات مجھ سے پہلے کہی گئی بالکل جامع اور مکمل تھی بڑے درد و خلوص کے ساتھ کہی گئی تھی۔

## اہل مرادآباد کو مبارکباد:

اب میں اپنی خوشی کا اظہار کرتا ہوں اور کہتا ہوں کہ آپ کو دیکھ کر میرے دل میں ایک طاقت پیدا ہوگئی۔ میں اہل مرادآباد کو مبارکباد دیتا ہوں اور اس مدرسہ کے منتظمین کو بھی مبارکباد دیتا ہوں کہ وہ آپ کو یہاں بلانے میں کامیاب ہوئے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ان کے تعلقات ہیں اور شہری زندگی میں وہ حصہ لیتے ہیں۔ یہ اس بات کا بھی ثبوت ہے کہ مدرسہ والے آپ کے لئے اجنبی نہیں ہیں۔ آپ نے اپنے اخلاق کا اور اپنی شرافت کا نقش قائم کر دیا۔ اب میں خدا سے دعا کرتا ہوں کہ اس کی نظیریں زیادہ سے زیادہ قائم ہوں۔ جب کوئی ایسی بات کہی جائے ایسا اعلان کیا جائے تو اس پر شوق کے ساتھ بڑی قدادیں لوگ جمع ہوں۔

میں اس پر اپنی تقریر ختم کرتا ہوں اور سمجھتا ہوں کہ یہ جو بات کہی گئی یہ صرف میری اور میرے چند ساتھیوں کی بات نہیں ہے بلکہ یہ آپ کی بھی اسی طرح بات ہے جس طرح میری ہے شاید آپ کی کچھ زیادہ ہو۔ بعض لوگ اپنی بات کہتے ہیں بہت تفصیل سے لیکن بہت سے لوگ ایسے ہوتے ہیں جو اپنی بات نہیں کہہ سکتے ہیں، ہر شخص مقرر نہیں ہوتا لیکن اس کے دل کی بات ہوتی ہے۔ اصل قیمت دل کی بات کی ہے زبان کی نہیں۔ میں نے اپنی زبان سے یہ بات کہی ہے لیکن میرا یقین ہے کہ یہ آپ کے دل کی بات ہے، اس کا کریڈٹ (Credit) مجھے آپ سے زیادہ نہیں پہنچتا۔ اس میں میں کسی تعریف کا مستحق نہیں۔ میں نے آپ سب کے دل کی بات کہی اور آپ کی ترجمانی کی۔

مجھے واقعی شکایت ہے اپنے ملک کے رہنماؤں سے کہ انہوں نے بہت وقت کھویا۔ سچی بات یہ ہے کہ میں اپنے کو بھی اس میں مجرم گردانتا ہوں ـــــ کاش کہ ہم نے جب ۵۲-۱۹۵۱ء سے یہ کام شروع کیا تھا۔ اسی وقت سے ہم اسی سرگرمی سے یہ کام کرتے تو آج ملک کی یہ فضا نہ ہوتی۔ میں اونچے ایوانوں تک اپنی آواز نہیں پہنچا سکتا۔ آپ کے ذریعہ اگر پہنچ جائے تو یہ بھی اچھی بات ہوگی۔ کہ میدان میں آنا چاہیئے اس ملک کے بچانے کے لئے۔ ایک ایک آدمی کا گریبان نہیں دامن پکڑ کر یہ کہنا چاہیئے کہ اس ملک کو سنبھالو اس ملک کو بچاؤ جس میں ہم رہتے ہیں۔ آدمی جس برتن میں کھاتا ہے اس میں چھید نہیں کرتا۔ ہم اس برتن میں نہیں بلکہ اس کشتی میں سوراخ کر رہے ہیں، جس میں ہم سوار ہیں۔ اگر یہ کشتی ڈوبی تو ہم کہاں جائیں گے۔ اور یہ ہمارے ادارے ہمارے سب آپس کے اختلافات، سیاسی پارٹیاں کہاں جائیں گی۔ بہت سے ملک ڈوب چکے، سمندر کی تہہ میں ہیں آج، کہیں ان کا پتہ نہیں۔ آج اس دنیا میں ان کا کہیں وجود نہیں۔ اور کس چیز نے ان کو ڈبویا؟ کسی دشمن نے ان کو نہیں ڈبویا بلکہ ان کے اعمال نے ڈبویا۔ ان کے گناہوں نے ڈبویا، ظلم نے، پاپ نے ڈبویا۔

**ہمارا اور ہر مذہب پر یقین رکھنے والے کا یقین ہے کہ خدا کو جو چیز سب سے زیادہ ناپسند ہے وہ ظلم ہے بس اس ظلم سے ہم کو بچنا چاہئے خواہ**

وہ ہم کسی فرقہ کے ساتھ کریں ـــــ ظلم ظلم ہے چاہے کسی کے ساتھ کیا جائے۔

## ایک مخلص کی وفات

مخدومنا المکرم حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی صاحب مدظلہ،

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ،

ابھی محرم الحرام کی ۲۰ر تاریخ کو حضرت والا نے اشرف منزل جودھپور میں جناب ابوالقمر حکیم محمد صدیق صاحب سے ملاقات کی تھی۔ مگر اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے کس کو کب میرے پاس آنا ہے۔

حکیم صدیق صاحب کل ۳۱ر دسمبر کی رات میں ۳۰ر محرم الحرام کا دن گذار کر یکم صفرالمظفر کی رات میں اللہ کو پیارے ہوگئے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون

مرحوم کی عمر ۷۶ سال کی تھی، شعبان ۱۳۲۲ھ میں ولادت ہوئی اور یکم صفرالمظفر ۱۳۹۹ھ کو وفات ہوئی اس طرح کل ۷۶ سال اور پانچ مہینے زندہ رہے۔

۱۸ سال کی عمر میں تعلیم سے فراغت حاصل کرلی تھی، تعلیم ہی نہیں حافظ بھی تھے، زبردست حکیم بھی تھے، عالم بھی تھے، انگریزی، فارسی اور عربی کے اچھے عالم تھے اساتذہ میں تین بہت مشہور ہیں، مولانا عبدالحیٔ صاحب بڑودوی، مولانا عبدالکریم صاحب جودھپوری، حکیم محمد ابراہیم صاحب صمصامی۔ انہیں حضرات سے قرآن وحدیث فقہ اور طب کا علم حاصل کیا۔

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ سے بیعت تھے، اصلاحی کام بہت کیا اور آزاد زندگی گذاری۔ تخلیہ پسند کرتے تھے۔ مطب جاتے اور واپس آتے گھر میں تمام وقت گذارتے تھے۔ آج سے دس سال قبل اشرف منزل کی مسجد میں مستقل تیس سال تک امامت کے فرائض انجام دیئے۔

دو لڑکے محمد عبداللہ فاروق، احمد عبداللہ فاروق، اور پانچ صاحبزادیاں چھوڑ کر انتقال فرمایا ہے۔

خادم التدریس

محمد عمران الاعظمی

دارالعلوم العربیۃ الاسلامیۃ جودھپور

۲ ۹۹ م

# "مُرید ہندی"

سعید، درگاہی

اقبال کا بیان ہے کہ وہ جو کچھ ہیں اور جو بن سکے ہیں اس کے لئے رومی کے مرہونِ منت ہیں۔ رومی نے ہی حکمت و وجدان اور عشق کی سرمستیوں سے انھیں روشناس کرایا۔ مفسر قرآن امام عاشقاں رومی نے قرآن کے علوم اور حکمتوں کی تفسیر و تعبیر میں ان کی کی۔ اقبال، رومی کو اپنا روحانی مُرشد تصور کرتے ہیں ہر مشکل مقام پر اپنے شیخ طریقت سے انھیں تشفی بخش حل مل جاتا ہے۔

اقبال کے ناقدوں اور شارحوں نیز مغرب کے کچھ دانشوروں کا خیال ہے کہ رومی کا کوئی حقیقی جانشین اور نائب پیدا ہوا تو ساڑھے چھ سو سال کے بعد ہند میں اقبال کی ذات میں ہوا خود اقبال کو اس بات کا فخر ہے کہ عصر کہن کے فتنوں میں جو کام رومی نے کیا تھا وہی کام انہوں نے فتنۂ عصر رواں میں کیا ہے۔

چو رومی در حرم دادم اذاں من | از و آموختم اسرارِ جاں، من
---|---
بہ دورِ فتنۂ عصرِ کہن او | بہ دورِ فتنۂ عصرِ رواں من

مفہوم:- میں نے رومی کی مانند حرم میں اذان کہی۔ روح کے راز کو میں نے ان سے سیکھا۔ اگلے زمانے کے فتنوں میں انہوں نے دورِ حاضر کے فتنے میں میں نے اذان کہی۔

اقبال نے اپنے کلام میں بار بار رومی سے استفادہ کا ذکر کیا ہے۔ مثلاً

تو بھی ہے اسی قافلۂ شوق میں اقبال | جس قافلۂ شوق کا سالار ہے رومی

مغربی فلسفہ کا گہرا مطالعہ کرنے کے بعد بھی جب زیست کا بھید نہ کھل سکا تو کہا

مرا از منطق آید بوی خامی | دلیلِ او دلیلِ ناتمامی
---|---
برویم بستہ در کارا کشاید | دو بیت از پیر رومی یا ز جامی

مفہوم: مجھے منطق سے عیب اور خامیوں کی بو آتی ہے۔ اس کی دلیل ناتمامی اور تشنگی کی دلیل ہے۔

رومی یا جامی کے دو اشعار نے میرے لئے بند دروازے کھول دیے ہیں۔

---

بکام خود دگر آں کہنہ مے ریز | کہ با جامش نیرزد ملک پرویز
---|---
ز اشعار جلال الدین رومی | بہ دیوارِ حریم دل بیاویز

مفہوم: اس پرانی شراب کو پھر سے استعمال کر کہ پرویز کی پوری مملکت اس کے ایک جام کے برابر نہیں ہو سکتی۔

جلال الدین رومی کے اشعار کو دل کی دیوار پر سجا لے۔

---

"بال جبریل" کا مکالمہ "پیر و مرید" تو گویا رومی کو اپنا مرشد تسلیم کرنے کا ایک مستند اعلان ہے اور جدید دنیا کے ذہنی انتشار اور عام خلفشار کے بارے میں پیر رومی سے جو اہم سوالات کئے ہیں اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ آج کی بے کل اور بے چین دنیا کا روحانی علاج کرنے کے لئے طبیبِ حاذق رومی کو ہر قدم پر اپنے ساتھ رکھنا چاہتے ہیں۔

مرید ہندی

چشم بینا سے ہے جاری جوئے خوں | علم حاضر سے ہے دیں زار و زبوں

پیر رومی

علم را بر تن زنی مارے بود | علم را بر دل زنی یارے بود

مفہوم: علم کو اگر جسم پر قبول کروگے تو وہ سانپ بنے گا۔ علم کو اگر دل پر قبول کروگے تو ہمدرد و یاور بنے گا۔

مرید ہندی

اے امامِ عاشقانِ دردمند | یاد ہے مجھ کو ترا حرفِ بلند

"خشک مغز و خشک تار و خشک پوست
از کجا می آید ایں آوازِ دوست"

دورِ حاضر مستِ چنگ و بے سرور | بے ثبات و بے یقین و بے حضور
---|---
کیا خبر اس کو کہ ہے یہ راز کیا | دوست کیا ہے دوست کی آواز کیا
آہ یورپ! با فروغ و تابناک | نغمہ اس کو کھینچتا ہے سوئے خاک

پیر رومی

بر سماع راست ہر کس چیر نیست | طعمۂ ہر مرغکے انجیر نیست

مفہوم: حق بات سننے کے لئے ہر شخص اہل نہیں ہوتا۔ ہر پرندے کے حصے میں انجیر نہیں ہوتا۔

مرید ہندی

پڑھ لیے میں نے علوم شرق و غرب | روح میں باقی ہے اب تک درد و کرب

پیر رومی

دست ہر نااہل بیمارت کند | سوئے مادر آ کہ تیمارت کند

مفہوم: ہر نااہل آدمی تجھے بیمار کر دے گا۔ ماں کی طرف رجوع کر کہ تیری چارہ گری کرے۔ ان اشعار میں بشریت کے کرب و درد، بے یقینی اور بے حضوری کی تشخیص کے ساتھ ساتھ اس بات کی نشان دہی بھی ملتی ہے کہ بشریت کے دکھوں کی اصل وجہ کیا ہے اور اس کا یقینی مداوا اور علاج بھی تجویز کیا۔ اقبال کو یقین ہے کہ آدم کا درد خود آدم کی کج بینی کی پیداوار ہے۔ آدم کو اپنے جس خیالی فلسفہ پر ناز ہے وہی اس کے لئے سمِ قاتل ثابت ہوا۔

تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی
جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائیدار ہوگا

---

بے تجلی مردِ ناداں رہ نبرد | از لکد کوبِ خیالِ خویش مُرد

مفہوم: آسمانی انوار کے سوا نادان شخص اپنی راہ تلاش نہیں کر سکتا۔ اپنے خیالات کی ٹھوکر سے موت کے گھاٹ اتر جاتا ہے۔

---

اقبال کے کلام میں دیدِ دیار، تلاش و جستجو کی تڑپ، سوزِ جگر، دیدۂ تر، دل کی بے تابیاں، نالۂ نیم شب کا نیاز، ان واردات کو اقبال عشق کی دین بتاتے ہیں اور بھٹکے ہوئے آدم کو عشق کی تجلی ہی سے صراطِ مستقیم میسر آ سکتی ہے۔ دل کی بے تابیاں، نالۂ نیم شب کا نیاز محض خوش آواز ادبی کلمات نہیں بلکہ اقبال کی گہری انسانی دکھن کی قلبی واردات ہیں۔

بہر انساں چشم من شبہا گریست

مفہوم: انسان کی کج فہمی کے لئے میں ان گنت راتوں میں خوب خوب رویا ہوں۔

دیدِ دوست، مکان و لامکاں کے رشتوں اور اسرارِ زیست کی جستجو میں اقبال افلاک کے روحانی سفر کا منصوبہ بناتے ہیں۔ "مرید ہندی" یہاں بھی "پیر رومی" کی رفاقت کی آرزو کرتے



# جنوبی فلپائن کے مسلمان

## خود مختار مسلم مملکت کے قیام کی جد و جہد

## فلپائن کی حکومت اس علاقے کے عیسائی باشندوں کو لبنان جیسے حالات پیدا کرنے کیلئے اکسا رہی ہے

تحریر: ابن عبداللطیف

[illegible]

جیلی کبھی عراق اور کبھی فرانس میں رہ کر رہے ہیں۔ وہ اپنے مشن سے غافل نہیں ہیں پھر بھی وطن میں اس طرح موجود نہیں رہ سکتے کہ حکومت ان کے خون کی پیاسی ہے۔ حکومت یہ پروپیگنڈہ کراتی ہے کہ مورو قومی محاذ آزادی کئی دھڑوں میں بٹ کر کمزور ہو گیا ہے لیکن حقیقت اس کے برعکس ہے۔ تحریک کی نوعیت کے سلسلہ میں تو محاذ کے اندر اختلاف ہو سکتا ہے کیونکہ دوسرے درجے کی برجوش قیادت کا تقاضہ ہے کہ کھل کر اعلان جنگ کر دینا چاہیے جب کہ اعلیٰ سطح کی بعض رہ قیادت اس کے تئیں مناسب موقع اور محل کا انتظار کرنا چاہتی ہے۔ لیکن اس اختلاف رائے کے باوجود جہاں تک تحریک کے اغراض و مقاصد کا تعلق ہے محاذ کے اندر کوئی اختلاف نہیں۔ محاذ آزادی کے مختلف حصے اس بارے میں متحد و ہم آواز ہیں۔ اس طرح فرڈیننڈ حکومت کی یہ تدبیر کہ محاذ کے اندر پھوٹ ڈال کر مسلمانوں کی تحریک آزادی کو ناکام بنا دیا جائے، ناکام ہی رہی ہے۔

[illegible]

پرنٹر پبلشر مسئول سید محمد الحسنی نے جے کے پرنٹرس دہلی میں طبع کرا کر، دفتر تعمیر حیات ندوہ لکھنؤ سے شائع کیا۔ ایڈیٹر اسحق جلیس ندوی

ہیں اور انھیں ناامید نہیں ہونا پڑتا۔ رومی کی روح ان پر آشکار ہوتی ہے اور اپنی قیادت میں انھیں افلاک کی سیر کراتی ہے۔ "جاوید نامہ" میں اقبال نے رومی کا تعارف اس طرح کرایا ہے

روحِ رومی پردہ ہا را بر درید — از پسِ کہ پارہ آمد پدید
طلعتش رخشندہ مثل آفتاب — شیب او فرخندہ چو عہد شباب
پیکرے روشن ز نور سرمدی — در سراپایش سرودِ سرمدی
بر لب او سرِّ پنہانِ وجود — بند ہائے حرف وصوت از خود گشود
حرف او آئینہ آویختہ — علم با سوز درون آمیختہ

مفہوم: رومی کی روح نے پردوں کو چاک کر دیا ہے۔ ٹیلے کے پیچھے ایک تودہ ظاہر ہوا۔ اس کی روشنی آفتاب کی طرح چمکدار ہے اس کا بڑھاپا دورِ جوانی کی طرح مبارک ہے۔

سرمدی نور سے اس کا پیکر روشن ہے۔ اس کی ہستی میں سرمدی نغمہ بسا ہوا ہے۔ اس کے سخن سے کائنات کا راز فاش ہوتا ہے۔ حرف اور آواز کے بندھن کھول دیتا ہے۔

اس کی بات آئینہ کی طرح روشن ہے۔ اس کا علم سوز دروں اور علم کا آمیزہ ہے۔

مثنوی میں رومی نے یہ کہہ کر عشق کی دہائی دی ہے ؎

ہر کرا جامہ زعشقے چاک شد — او ز حرص و عیب کلی پاک شد
شاد باش اے عشق خوش سودائے ما — اے طبیب جملہ علت ہائے ما
جسم خاک از عشق بر افلاک شد — کوہ در رقص آمد و چالاک شد

مفہوم: جس کسی کا لباس عشق سے چاک ہو گیا وہ طمع اور عیوب سے مکمل طور پر پاک ہو جاتا ہے۔ مبارکباد اے ہم میں دیوانگی پیدا کرنے والے عشق اے ہماری تمام بیماریوں کے طبیب۔

عشق سے خاکی وجود آسمانوں تک پہنچ گیا۔ پہاڑ جاندار ہو کر رقص کرنے لگا۔ کائنات اور زندگی پر فتح حاصل کرنے کے لئے عشق ہی کارگر وسیلہ ہے۔ مقصدِ حیات آرزو میں حرارت پیدا کرتا ہے۔

مقصدے از آسماں بالا ترے — دلربائے، داستانے، دلبرے
ما ز تخلیق مقاصد زندہ ایم — وز شعاعِ آرزو تابندہ ایم

مفہوم: مقصدِ حیات آسمان سے بھی زیادہ بلند ہے۔ دلبر کی داستان دلربا ہوتی ہے ہم مقاصد کی تخلیق سے ہی زندہ ہیں اور آرزوؤں کی شعاعوں سے ہی منوّر ہیں۔

اقبال نے جاوید کو خطاب کرتے ہوئے کہا۔

پیرِ رومی را رفیقِ راہ ساز — تا خدا بخشد ترا سوز و گداز

مفہوم: سفرِ حیات میں رومی کی رفاقت اختیار کر تاکہ خدا تجھے سوز و گداز سے سرفراز فرمائے۔

"اقبال کا نصب العین یہ ہے کہ اسی سوز و گداز سے علم و حکمت تک رسائی ہو سکتی ہے۔ اقبال کو جس کی طلب ہے وہ ہے زندگی کا سوز، اور ایک فلسفۂ حیات، ان مسائل میں اقبال کو رومی سے بہتر کوئی رہنما میسر نہیں آیا۔

رومی آں عشق و محبت را دلیل
تشنہ کاماں را کلامش سلسبیل

مفہوم: رومی عشق و محبت کی دلیل ہے پیاسوں کے لئے اس کا کلام سلسبیل ہے۔

بقول ڈاکٹر سید عبداللہ۔

"اقبال نے شعر و شاعری میں بھی اس سلسبیل سے پیاس بجھائی ہے اور اپنے حکیمانہ خطبات میں بھی، مگر اقبال کا استفادہ صرف استفادہ ہی نہیں افادہ بھی ہے۔ انہوں نے رومی سے صرف لیا ہی نہیں ان کو کچھ دیا بھی ہے۔ بہت کچھ! معتد بہ! اقبال کی پیش کش رومی کی بارگاہ میں وہ نئی تعبیر و توجیہ مثنوی ہے۔ جس سے رومی کے خیالات میں نئی تابانی نئی چمک پیدا ہو گئی ہے۔ رومی کی روح پہلی مرتبہ ان قیود سے آزاد ہوئی جن میں پرانے فرہنگ نویسوں اور شرح نگاروں نے اسے قید کر رکھا تھا۔ اقبال نے رومی کو جدید حکمت سے متعارف کرایا ہے اور علم و دانش کے جدید ترین دبستانوں پر یہ ثابت کر دیا ہے کہ رومی کے پاس عصرِ حاضر کے ان مسائل پیچیدہ کے کامیاب حل موجود ہیں جن سے انسان حواس باختہ ہو کر خود انسان کی روشن تقدیر سے مایوس ہو رہا ہے۔ موجودہ دور میں انسان کو ایک ایسے مذہب (مسلکِ فکر و عمل) کی تلاش ہے جس کے اساسی (بنیادی) اصولوں سے سائنس بھی انکار نہ کر سکے اور ایسے سائنسی نقطۂ نظر کی ضرورت ہے جس میں "وحدانیت" کے وجود کو تسلیم کئے بغیر چارہ نہ رہے۔ زیرکی اور عشق کا یہ اجتماع انسان کے روشن مستقبل کے لئے اتنا ہی ضروری ہے جتنا جسم انسانی کے لئے آب و ہوا کا وجود، اقبال نے ان میں سے اکثر مسائل کے حل مولانا رومی کے حوالہ سے پیش کئے ہیں اور یہ حکمتِ رومی کی سب سے بڑی خدمت ہے"۔

رومی کا دور عام بے چینی اور نفسی نفسی کا دور تھا۔ مثنوی میں وہ جذب و سرور، وجد و حال، عشق و سرمستی تھی جس کی اس زمانے کی بے قرار اور پریشان روحوں کو ضرورت تھی۔ اقبال بھی ایسے زمانے میں پیدا ہوئے جب یقین و اعتماد کی پناہ گاہ متزلزل ہو چکی تھی۔ لوگ عام طور سے تنہائی اور روحانی گھٹن کے شکار ہو گئے تھے۔ لوگ خدا، انسان اور کائنات کا اعتقاد کھو بیٹھے تھے۔ بے اعتمادی نے جذبات میں اس قدر ہیجان پیدا کر دیا تھا کہ کبھی کبھی محض کلیوں کے چٹکنے پر جنگ و جدال کا بازار گرم ہو جاتا۔ خدا کی بستی دُوکان بن گئی۔

ان نئے حالات میں اقبال ایک دردمند مفکر کی حیثیت سے میدان میں آئے۔ انہوں نے مشرق و مغرب کے حالات کا بھرپور جائزہ لیا۔ اقبال نے مشرق و مغرب کو صرف سیاسی حیثیت ہی سے نہیں بلکہ عمرانی اور فکری زاویۂ نگاہ سے دیکھا۔ اقبال نے دیکھا کہ مغرب اپنے تمام علوم و فنون کے باوجود ذہنی اور روحانی خلفشار میں مبتلا ہے۔ زندگی کا شیرازہ ریزہ ریزہ بکھر گیا ہے۔ موجودہ دور کا انسان جو اپنی حکمت عملی پر نازاں تھا۔ اپنے حسرتناک انجام پر ششدر کھڑا تھا۔ اور کسی دردمند راہ داں کی صدا کا منتظر تھا۔ اقبال نے یقین محکم کے ساتھ جدید انسان کو یہ کہہ کر محفلِ عشق میں مدعو کیا ؎

در آ بہ حلقۂ پیری کہ دلبری داند

مفہوم: اس بزرگ کے حلقے میں شریک ہو جا جو جانتا ہے کہ دلبری کیا ہے عشق کی شوریدہ سری کی تمنا کی۔

خرد کی گتھیاں سلجھا چکا میں
مرے مولا مجھے صاحب جنوں کر

اقبال نے اپنے مخصوص دردمندانہ اور والہانہ انداز میں نئے دور کے دُکھے ہوئے انسان کے لیے پیرِ رومی کا وہی عشق و محبت کا آزمودہ اور تیر بہدف نسخہ تجویز کیا۔

محبت ہی سے پائی ہے شفا بیمار قوموں نے

---

عشق ہے ابن السبیل اس کے ہزاروں مقام

---

عشق خدا کا رسول، عشق خدا کا کلام

---

عقل و دل و نگاہ کا مرشد اولیں ہے عشق
عشق نہ ہو تو شرع و دیں بتکدۂ تصورات



عشق تمام مصطفےٰ! عشق تمام بولہب

---

عشق کے مضراب سے نغمۂ تارِ حیات — عشق سے نورِ حیات عشق سے نارِ حیات
صدقِ خلیلؑ بھی ہے عشق، صبرِ حسینؑ بھی ہے عشق

---

عشق گرمیٔ شوق اور سوزِ آرزو کا نام ہے جو کسی عظیم مقصد کی لگن میں ہو۔ عشق وہ نور ہے جو پروانے کو سوزِ کلیم سکھاتا ہے اور زندگی کی شب تاریک کو روشن کرتا ہے، عشق ذہنی صلاحیتوں کو بے راہروی سے روکتا ہے۔ عشق ہی انسان کو خدا کے قریب لیجاتا ہے اور انسان، انسان کے درمیانی رشتوں کو استوار اور مستحکم بناتا ہے۔ اعلیٰ انسانی مقاصد کی لگن اور محبوبِ مطلق کے قرب کی تمنا عشق کو جلا بخشتی ہے۔ انسانیت کی تمام دکھن اور گھٹن کا واحد علاج عشق ہے۔ عشق آدمی کو اتھاہ سمندروں کی گہرائی، گیرائی اور وسعت عطا کرتا ہے۔ عشق انسان کو صبر و تحمّل، عزتِ نفس، ضبطِ نفس، استغنا، وسعتِ قلب، فراست، غیرت، متانت، اخلاقی عظمت، دردمندی، خودداری، رواداری، دماغی ہمہ گیری، محبت، ہمدردی اور سوز و گداز سے بھر دیتا ہے۔

آج یورپ کے کئی اربابِ دانش کی نظریں مشرق کی طرف اُٹھ رہی ہیں۔ اور رومی و اقبال کے نظریات پر غیر معمولی توجہ دے رہے ہیں۔ مغرب اپنے موجودہ جدّت پسند فلسفہ سے دل برداشتہ ہو چکا ہے۔

رومی و اقبال نے بشر کو اس کا آدم ہونا یاد دلایا ہے اور نیابت الٰہی کے منصب کو پہچاننے کی تلقین کی ہے۔ اپنے اس منصب اعلیٰ کی اہلیت پیدا کرنے کے لئے "خودی" یعنی خودنگری اور خودگری کی تعلیم دی ہے تاکہ عشق کے اعلیٰ مراتب حاصل کر سکے اور انسان۔ خدا اور انسان کا ہو کر خدا کی خدائی کا حصہ دار بن سکے۔ رومی اور اقبال دونوں کائنات پر مسجودِ ملائک آدم کا اقتدار چاہتے ہیں۔ آفاق میں انسان کو سرخرو دیکھنا چاہئے ہیں۔

رومی و اقبال کا فکر مشرق یا مغرب ہی نہیں بلکہ تمام نوعِ انسانی کو محیط ہے۔!!

---

پرشین اکیڈمی کی جانب سے فارسی غزلوں کے طرحی مقابلے کا تفصیلی اعلان مختلف اخبارات میں شائع ہو چکا ہے۔

اب تمام فارسی گو شعراء کو اطلاع دی جاتی ہے کہ اس کمپٹیشن میں شرکت کے لئے ذیل کے مصرع طرح پر اپنی طرحی غزل کی کم از کم چار کاپیاں ۱۵ جنوری کی بجائے ۱۵ مئی ۱۹۷۹ء تک ارسال کر سکتے ہیں۔

مصرع طرح:-

؏ آں را کہ نیست گرمی ایماں، حیات نیست

پتہ:
رئیس نعمانی، ڈائرکٹر پرشین اکیڈمی
۱۹۱ اصطبل چارباغ لکھنؤ
۲۲۶۰۰۱

---

مدیر تعمیر حیات جنوبی ریاستوں تامل ناڈ، کرناٹک اور کیرالا کا تحریک پیام انسانیت کے سلسلہ میں ۲۰ جنوری سے دورہ کریںگے، واپسی ماہ فروری کے اوائل میں متوقع ہے۔
(منیجر تعمیر حیات)

---

# غزل

ابوالمجاہد زاہدؔ

کچھ علاجِ شب کرو، تا حدِ امکاں ہی سہی
چاند اُگا سکتے نہیں، سعیٔ چراغاں ہی سہی

اپنے غم کو یوں نبھانے کا سلیقہ ہے کسے؟
پھول پھر بھی ہنس رہا ہے، چاک داماں ہی سہی

اذنِ نظارہ کہاں میری نگاہِ شوق کو
وہ سراپا ناز مہمانِ رگِ جاں ہی سہی

بڑھتی ہی جاتی ہے تقدیرِ زمیں کی تیرگی
عصرِ نو کے ہاتھ میں مہرِ درخشاں ہی سہی

کوئی تو اُٹھ کر لگاتا آدمیت کو گلے
کوئی ہندو ہی سہی، کوئی مسلماں ہی سہی

آپ کے دل میں مگر باطل سے وہ نفرت کہاں؟
حق پرستی آپ کا آئین و ایماں ہی سہی

ہم جو سلجھانے پہ آ جائیں تو کچھ مشکل نہیں
زلفِ ہستی ہی سہی، گیسوئے دوراں ہی سہی

آگ کا یہ رقص، یہ پھولوں کے جلتے پیرہن
تم گلستاں اس کو کہتے ہو، گلستاں ہی سہی

پھر بھی زاہدؔ موردِ الزام ہے میری زباں
میں گلستاں میں غزل خواں و گل افشاں ہی سہی

---

پیامِ انسانیت

ابوالاسرار رمزی اٹاوی جودھپور

# انجمن آرائی

تم کو بھیجا ہے یہاں امن و اماں کے واسطے — تم خیرِ امت بن کے آئے ہو جہاں کے واسطے
راہ میں آنکھیں بچھا دو کارواں کے واسطے — فرشِ گل بن جاؤ ہر پیر و جواں کے واسطے

تم امیرِ کارواں ہو کارواں کو ساتھ لو
راہ میں جو ملتا جائے اسکو ہاتھوں ہاتھ لو

اس جہاں میں رنگ و بو کی انجمن پیدا کرو — نونہالوں کے لئے تازہ چمن پیدا کرو
پھر محبت کی وہی رسمِ کہن پیدا کرو — تم وطن میں اک نئی شانِ وطن پیدا کرو

یوں وفا کے گیت گاؤ زندگی کے ساز پر
جھوم اٹھے سارا زمانہ ایک ہی آواز پر

تم کو فطرت نے چُنا ہے جاں نثاری کے لئے — دستگیری، دردمندی غمگساری کے لئے
خونِ دل چھڑکو آبیاری کے لئے — تم جگر پارے لٹا دو لالہ کاری کے لئے

کام ایسا ہو کہ دنیا "آفریں" کہنے لگے
اس زمیں کو آسماں "خلدِ بریں" کہنے لگے

# ادب و ثقافت

## ڈاکٹر علی نہاد تارلان

### ترکی میں اقبالیات کے سب سے بڑے ماہر

تحریر: ثروت صولت

ترکی میں علامہ اقبال کے کلام کے سب سے بڑے مترجم اور ماہر اقبالیات ڈاکٹر علی نہاد تارلان کا ۷ اکتوبر ۱۹۷۸ء کو انتقال ہو گیا۔ ڈاکٹر علی نہاد تارلان ۱۸۹۸ء میں استنبول کے محلہ وزنہ جیلر میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کے والد محمد لطیف بے عثمانی فوج میں محاسب تھے۔ ڈاکٹر علی نہاد نے ابتدائی تعلیم مناستر میں پائی۔ اس کے بعد سالونیکا کے فرانسیسی مدرسہ میں فرانسیسی زبان سیکھی۔ اب یہ شہر بالترتیب یوگوسلاویہ اور یونان میں واقع ہیں، لیکن اس وقت سلطنت عثمانیہ میں شامل تھے۔ ڈاکٹر علی نہاد اس کے بعد ۱۹۱۰ء میں اپنے والد کے ساتھ استنبول آگئے اور وہاں [illegible] رشدیہ نامی مدرسہ میں داخل ہوئے۔ اس مدرسہ میں تیرہ سال کی عمر میں انہوں نے پہلا شعر کہا اور رشدیہ میں اعلیٰ درجے میں کامیاب ہونے کے بعد وہ پہلے مدرسہ دار المعلمین میں اور اس کے بعد استنبول یونیورسٹی میں داخل ہوئے جو اس زمانہ میں دار الفنون کہلاتی تھی۔ اس یونیورسٹی میں انہوں نے ۱۹۱۹ء میں فرانسیسی اور فارسی زبان کی تکمیل کی۔ اس کے بعد وہ استنبول کے مشہور مدرسہ غلطہ سرائے کالج میں فارسی کے استاد ہو گئے۔ ۱۹۲۰ء میں ان کو ڈاکٹری کی سند ملی، ان کے مقالہ کا موضوع اسلامی ادبیات میں لیلیٰ مجنوں مثنویاں تھا۔ ڈاکٹر علی نہاد ترکی کی یونیورسٹیوں کی تاریخ میں پہلے شخص ہیں جنہوں نے ادبیات میں ڈاکٹری کی سند حاصل کی۔ ڈاکٹر علی نہاد نے تقریباً ۱۵ سال تک ترکی کے مختلف مدرسوں میں فرانسیسی زبان، ترکی زبان اور ادبیات کے معلم کی حیثیت سے فرائض انجام دیئے، اعلیٰ تعلیم کے اسلامی انسٹی ٹیوٹ اور استنبول یونیورسٹی میں بھی وہ فارسی کے استاد رہے۔ [illegible]

۱۹۳۳ء میں وہ استنبول یونیورسٹی میں ترکی زبان اور ادب کے ریڈر ہوئے، اور ۱۹۳۷ء میں پروفیسر ہو گئے اور [illegible] میں ترکی زبان اور ادب کے شعبے کے صدر ہو گئے۔ ان کا ۷ اکتوبر ۱۹۷۸ء کو انتقال ہوا، جامع [illegible] میں نماز جنازہ پڑھی گئی، اور استنبول کے نواح میں موضع [illegible] (CERENKOY) کے آبائی قبرستان میں دفن کئے گئے۔

[illegible]

### روداد فضلی بزبان فضلی

## قیام پاکستان سے قبل ہندو ہر معاملہ میں مسلمانوں کے طرز عمل کی تقلید کرتے تھے

[illegible]



# مولانا عبدالوہاب صاحب

حریت پسند قائد | عالم باعمل | خلیفہ حضرت عبدالقادر رائپوریؒ

## ایک سورج تھا جو ڈوب گیا

از: حکیم محمد حسین خاں شفا (مدرسہ کہنہ رام پور (یو۔پی))

۲۲ نومبر ۱۹۷۶ء دن ڈھلے شہر رامپور میں اس خبر نے گشت کیا کہ مولانا عبدالوہاب خاں صاحب کا انتقال ہو گیا۔ ایک جوان نے دوسرے کی طرف دیکھا۔ دونوں مولانا کے نام اور کام سے بے خبر نکلے۔ خیال کیا، ہوں گے کوئی مولانا۔ آگے بڑھے تو معمر لوگوں میں کچھ چرچا تھا،

ایک دوسرے سے کہہ رہا تھا۔۔۔

بھائی اچھے آدمی تھے۔ اپنے وقت کے بہت بڑے سیاسی تھے؟۔۔۔ مگر جب سے ہم نے دیکھا عالم باعمل تھے، حدیث پڑھایا کرتے تھے۔ الغرض جتنے منہ اتنی باتیں۔۔۔

مولانا رام پور کی ان چند عظیم ہستیوں میں سے تھے، جن کو مقامی طور پر یا تو بالکل نہیں سمجھا گیا یا کچھ لوگوں نے سمجھا بھی تو بہت کم۔۔۔ گویا کہ وہ ایک ایسا پھول تھا جو غیر فطری فضا میں پیدا ہو گیا تھا۔

میرا اور مولانا کا استاد شاگردی کا تعلق رہا، لیکن یہ تعلق ایسے دور میں شروع ہوا جب مولانا آتش فشاں پہاڑ سے راکھ کا ڈھیر ہو چکے تھے اور عشق رسول میں فنا تھے وہ اپنے سلسلۂ سلوک کی اعلیٰ منزل "یقین کامل" پر فائز تھے۔ حدیث و قرآن کے علاوہ دیگر فنون سے اس وقت مولانا کو کوئی رغبت نہیں تھی۔ اکثر اپنے پیر و مرشد کا یہ پسندیدہ شعر پڑھا کرتے تھے جو حسب حال تھا ؎

دل ڈھونڈنا سینہ میں مرے بوالعجبی ہے
اک ڈھیر ہے یاں راکھ کا اور آگ دبی ہے

آپ کا اپنی زندگی کے حسین پہلوؤں کے بارے میں مسلک یہ ہو گیا تھا۔

عشق عیاں است گر مستور نیست

مولانا کے بارے میں میں نے اپنے بزرگوں مولوی علی حسن خاں وغیرہ اور ان کے ہم عمر و شریک کار اشخاص سے جو کچھ سن رکھا تھا اس کا معمولی شائبہ بھی مولانا میں نہیں پایا۔ لیکن میں ایک سال تک برابر کوشش کرتا رہا کہ اس راکھ کے ڈھیر میں سے کچھ نہ کچھ نورانی چنگاریاں جمع کی جائیں جب درس سے فارغ ہو کر مولانا اچھے موڈ میں ہوتے تو میں کوئی نہ کوئی ان کی زندگی سے متعلق سوال کرتا مگر جب بھی مولانا کو یہ احساس ہو جاتا کہ جواب صفحۂ قرطاس پر نمودار ہو کر ان کی گم کردہ کتاب زندگی کی شیرازہ بندی کا سبب بن سکتا ہے تو مولانا حکمت عملی سے بات کا رخ موڑ دیتے گویا کہ وہ اہل وطن سے اس درجہ شاکی ہیں کہ اب نہیں چاہتے کہ ان کی زندگی کا وہ باب کھولا جائے جس میں ان کی، وطن اور اہل وطن کی خاطر دی ہوئی قربانیاں ہیں۔ اور قوم و وطن کا دیا ہوا ان کو اس قربانی کا صلہ ہے۔ مولانا کا دلی جذبہ اس سلسلہ میں کچھ یہ تھا ؎

داور حشر میرا نامۂ اعمال نہ دیکھ
اس میں کچھ پردہ نشینوں کے بھی نام آتے ہیں

مولانا نہیں چاہتے تھے کہ ان کی زبان سے کوئی ایسا سچا واقعہ بھی نکلے، جس سے وطن یا اہل وطن کی پردہ دری ہو۔ اور ان کے دامن سے وابستہ سیاسی منافقین کی بے پردگی ہو حالانکہ یہ بات اکثر لوگوں کے علم میں ہے کہ ایک دور میں "مولانا عبدالوہاب خاں" اور "خانان رام پور" ایک ہی شخص کے دو نام اور ایک ہی تصویر کے دو رخ تھے۔ جس طرح حریت پسند ریاست کشمیر کو شیخ محمد عبداللہ کے نام سے جانتے تھے۔ اسی طرح ریاست رام پور مولانا کے نام سے منسوب تھی۔ کئی مرتبہ "قصر ظلمت" میں آپ کے قتل کی سازش ہوئی۔۔ لیکن خریدے ہوئے قاتل نے جب اپنے ضمیر کا جائزہ لیا تو اس کے ضمیر نے مولانا کے خلوص نیت، حب وطنی، زہد و تقویٰ کی شہادت دی اور خود ہی مولانا کو سازش سے باخبر کر دیا۔۔۔

ریاست کا بچہ بچہ مولانا کا نام عزت و احترام سے لیا کرتا تھا۔ سخت نگرانی کے باوجود بھی مولانا اطمینان سے بیرون رام پور ہونے والی کانگریس کی خفیہ میٹنگوں میں شریک ہوتے تھے اور سرکاری ذرائع بالکل بے خبر رہتے تھے۔

مولانا تمام عمر "شہرت و دولت" سے متنفر رہے اور ایسے تمام واقعات کو بھی چھپاتے رہے۔ جن سے ان کی نام آوری ہو لیکن مولانا کے دوست و احباب ان تمام واقعات سے بے خبر ہیں مولانا کی زندگی بالکل سادہ اور سپاٹ ہے جس میں مختلف منزلوں کے نشانات کو نمایاں طور پر عبدالوہاب، عبدالوہاب خاں، مولوی عبدالوہاب خاں قائد اعظم رام پور اور صوفی عبدالوہاب میاں کی حیثیت سے دیکھے جا سکتے ہیں، آپ کبھی بھی دو رخی یا ظاہر و باطن کے قائل نہیں رہے، ہمیشہ ایک ہی گھوڑے کی سواری کی ہے۔ آپ نے دیکھا کہ موجودہ سواری کا ساتھ دنیا ان کے لئے دشوار ہے تو پوری دیانت داری کے ساتھ اس کو چھوڑ دیا آپ نے کبھی بھی ریاکاری یا پینترے بازی سے کام نہیں لیا۔ مولانا پر سب سے بڑی تہمت سیاسی ہونے کی ہے جب کہ زندگی میں وہ کبھی بھی معروف معنی میں سیاسی نہیں رہے صرف کچھ اصولوں کی خاطر ملک و قوم کا قرضہ ادا کرنے کے لئے اس میدان کا رخ کیا تھا۔ جس طرح امام ابو حنیفہؒ یا ابن تیمیہؒ نے ؎

گلہ ہے مجھ کو زمانے کی کور ذوقی سے
سمجھتا ہے مری محنت کو محنت فرہاد

مولانا کی پیدائش محسن اعظم رامپور جنرل اعظم الدین خاں کی شہادت کے چند ماہ بعد ۱۸۹۱ء ۱۲۸۰ھ میں گھیر یوسف خاں تکیہ سماران میں ہوئی۔ آپ کے والد حافظ عبدالغفار خاں ایک زندہ دل ظریف الطبع انسان تھے۔ مولانا کا بچپن اور یہ دور مدرسہ عالیہ کا عہد شباب تھا۔

مدرسین میں اکثر اساتذہ اسی ادارہ کے فارغین تھے۔ عام شہرت یافتہ ہونے کے ساتھ ساتھ ان کو اس ادارے سے جذباتی لگاؤ بھی تھا۔ مولانا کے پیر و مرشد حضرت عبدالقادر رائے پوریؒ بھی مدرسہ عالیہ رام پور کے فاضل تھے (ابوالکلام آزاد نے بھی مولانا محمد شاہ صاحب رام پوری کے مختصر قیام کے دوران درس میں شریک ہو کر اعلیٰ تعلیم کی تکمیل کی تھی)۔ اس وقت مدرسہ عالیہ کے اساتذہ میں مولوی حفظ اللہ صاحب، مولوی ظہور الحسن صاحب، مولوی فصیح الزماں صاحب، مولوی طیب مکی، مولوی سیف الدین صاحب، مولانا محمد امین صاحب، مولانا حسن شاہ صاحب، مولانا غلام محمد صاحب اور مولانا منظور علی صاحب جیسے نامور مدرس تھے۔ عبدالوہاب صاحب نے بھی ان بزرگوں سے استفادہ کیا آپ کے خاص اساتذہ میں مولانا منور علی صاحب تھے۔ راقم الحروف کو مولانا نے جو سند حدیث عنایت کی ہے وہ بھی مولانا منور علی صاحب کی عطا کردہ ہے آپ کو فخر تھا کہ آپ کا سلسلۂ حدیث چند واسطوں سے حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ تک پہونچتا ہے۔

مولانا رام پور میں تعلیم سے فارغ ہو کر سنہ ۱۹۱۰ء میں الٰہ آباد چلے گئے۔ وہاں درس و تدریس کا سلسلہ بھی شروع کیا اور تعلیم طب بھی حاصل کی۔

میرے ایک سوال کے جواب میں مولانا نے فرمایا تھا، "ایک روز میں استاد کے مطب میں نسخہ نویسی کر رہا تھا۔ ایک بہت باتونی مریض آیا۔ اور غیر ضروری باتیں

وغیرہ کے بارے میں سوال کرنے لگا۔ یہ کھاؤں اور یہ نہ کھاؤں۔ مجھے یہ بات ناگوار معلوم ہوئی اور میں نے اپنے پاس بیٹھے ہوئے دوسرے طالب علم سے کہا کہ کہہ دے کہ "سنکھیا کھالے"۔ یہ بات استاد نے سن لی۔ اور مجھ سے کہا عبدالوہاب خاں صاحب "طب تمہارے بس کی بات نہیں ہے"۔ میں نے بھی اسی دن سے مطب سے ناطہ توڑ لیا۔ . . "

اس کے بعد مولانا رام پور چلے آئے مختلف مدارس میں درس و تدریس کا سلسلہ رہا۔ آخر میں اپنا ایک مدرسہ جامعۃ المعارف قائم کیا . . . جو اب مدرسہ عالیہ کی طرح لب گور ہے . . . مولانا کی توجہ تصنیف و تالیف کی طرف زیادہ نہ تھی بلکہ شخصیت سازی پر تھی، مگر پھر بھی کبھی کبھی کچھ لکھ لیتے تھے۔ کچھ مضامین بغیر نام کے بھی مدینہ اخبار میں اور کچھ اپنے نام سے مختلف اخبار و رسائل میں لکھے اور ایک مناظرانہ رسالہ "حالات و الہامات مرزا" کے نام سے شائع ہوا۔ مولانا اپنی زندگی کا ماحصل "تفسیر تقریب القرآن" کو قرار دیتے تھے لیکن پوری کتاب کی طباعت نہ ہونے کی وجہ سے اس کا ذکر بہت دکھ کے ساتھ کرتے تھے۔

مولانا کا طریقۂ درس قدیم طرز کا تھا متن کے ساتھ ساتھ تقریر کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔ اور غیر متعلق موضوع پر بات چیت کرنے کی قطعاً اجازت نہ تھی۔ مولانا کی پوری توجہ اس بات پر رہتی تھی کہ طالب علم میں اتنی استعداد پیدا ہو جائے کہ اس کو ان موضوعات سے متعلق سخت سے سخت کتاب پڑھنے میں دشواری نہ ہو۔

علم حدیث میں مولانا ہندوستان گیر شہرت کے مالک تھے۔ مولانا حسین احمد صاحب مدنیؒ کے انتقال کے بعد دیو بند میں ان کے بلانے کی کوشش کی گئی۔ لیکن آپ کسی قیمت پر بھی رام پور چھوڑنے پر آمادہ نہیں ہوئے۔ اس بارے میں مولانا اپنے ہم وطن شاعر کے ہم مسلک تھے ؎

وطن کی اس سرزمین کو اے شاد،
کون سے دل سے چھوڑ دیں ہم
وطن کی جس سرزمیں پہ گذرا ہے،
دورِ دار و رسن ہمارا

مولانا اپنی جوانی میں کافی حوصلہ مند بے باک اور زود حس تھے۔ آپ نے اپنی سیاسی زندگی کے بارے میں بتایا تھا کہ کچھ تو الٰہ آباد کا اثر، ادھر میرے محلہ میں ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس نے مجھ اس میدانِ خارزار میں ڈال دیا۔ آپ نے فرمایا، میرے محلہ کے ایک معزز شخص سے نواب صاحب کچھ ناراض ہو گئے، اور جابرانہ طور پر بغیر کوئی سبب بتائے ان کی تذلیل کی گئی اور مختلف قسم کی تکالیف پہنچائی گئیں یہ واقعہ میرے لئے ناقابل برداشت ہو گیا اور میں نے شہنشاہیت و شخصی حکمرانی کے خلاف جدوجہد کرنے کا تہیہ کر لیا۔ اسی دوران میں مجھے معلوم ہوا کچھ اور افراد بھی اسی طریقہ سے سوچ رہے ہیں اور ایک انجمن بنائی ہے۔ جس کی خفیہ میٹنگس بھی ہوتی ہیں۔ میں بھی اس میں شامل ہو گیا ؎

خنجر چلے کسی پہ تڑپتے ہیں ہم امیر
سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے

مولانا کے ساتھیوں کا کہنا ہے کہ آپ کی شمولیت سے اس تحریک نے وہی موڑ لیا جو تحریک اسلام نے حضرت عمرؓ کی شمولیت سے لیا تھا۔ آپ کسی کارروائی کو خفیہ رکھنے کے قائل نہیں تھے۔ آپ کے مشورہ سے سب نے کانگریس سے تعلق پیدا کر لیا جس کے تحت ۱۹۳۲ء میں باقاعدہ نواب صاحب کو "آئینی حکومت" اور عوامی مطالبات سے متعلق تحریری تجاویز پیش کر دی گئیں، جو متعدد بار قید و بند کی صعوبتیں برداشت کرنے کے بعد منظور ہو گئیں۔

یہ رام پور کی تاریخ کا کٹھن دور تھا اور مولانا کی زندگی کا انتہائی نازک وقت، ہر لمحہ نئی سازش اور ہر وقت نئے خطرات، پورا ملک بحرانی دور سے گذر رہا تھا برٹش حکومت دم توڑ رہی تھی۔ انگریزوں کا اخراج یقینی ہو گیا تھا لیکن ریاستوں کی حالت غیر یقینی تھی۔ اس دوران مولانا کی شہرت شباب پر تھی۔ چوٹی کے کانگریسی لیڈروں سے آپ کے دوستانہ تعلقات تھے، سب لوگ آپ کو ریاست رام پور کا عوامی نمائندہ تسلیم کرتے تھے اس وقت مولانا دو محاذوں پر کام کر رہے تھے۔ ایک رام پور میں آئینی حکومت" اور محب وطن ہمدرد عوام کی زیادہ سے زیادہ نمائندگی، دوسرے کانگریسی حکومت اور رام پور کی "آئینی حکومت" کے درمیان روابط۔ اس سلسلہ میں مولانا اکثر کانگریسی لیڈروں سے ملے۔ آخرکار جمعیۃ العلماء کا آپ نے سہارا لیا اور مولانا محمد میاں و مولانا احمد سعید صاحب کے ساتھ ۱۹۴۷ء میں مولانا ابوالکلام آزاد اور سردار پٹیل سے یہ وعدہ لے لیا کہ ریاست رام پور کا فی الحال الحاق نہیں کیا جائے گا اس کی مشرقی تہذیبی حیثیت اور خاص ماحول کو برقرار رکھا جائے گا۔ مولانا نے ابوالکلام آزاد کو پورے طور پر رام پوری مسائل سے دلچسپی لینے پر آمادہ کر لیا تھا۔ مولانا آزاد نے عبدالوہاب صاحب کو یہ یقین دلایا تھا کہ پہلے رام پوری عوام کی فلاح و بہبود کی تدابیر کی جائیں گی اس کے بعد ریاست کو الحاق کرنے نہ کرنے کے مسئلہ پر غور کیا جائے گا۔ مولانا عبدالوہاب صاحب دہلی سے اس یقین دہانی کے بعد رام پور آئے۔ ادھر غیر رامپوری حکام اور "محلاتی سازش" کے تحت ریاست کو تہہ و بالا کر دیا گیا۔ اور رامپوری عوام کو ناقابل تلافی نقصان پہنچایا گیا، اور جلد بازی میں یہ فرمان جاری کرا دیا گیا۔

"ہم نے حکومت ہند کی وفاداری اور اپنی رعایا کی فلاح کے پیش نظر ریاست رامپور کو یکم جولائی ۱۹۴۹ء سے مرکزی حکومت ہند سے الحاق ہونا تسلیم کر لیا ہے"۔

(۷ا مئی گزٹ رامپور ۱۹۴۹ء)

تقسیم ہند اور انضمامِ ریاست کے بعد بھی مولانا نے کچھ دنوں اپنی جدوجہد جاری رکھی لیکن ملکی حالات اس درجہ ناگفتہ بہ ہو گئے تھے ایسے حالات میں مولانا کے لئے بھی جدوجہد جاری رکھنا ممکن نہ رہا اور انہوں نے صرف سیاست سے ہی نہیں سماجی زندگی سے بھی کنارہ کشی کر لی اور مولانا عبدالقادر صاحب رائے پوری خلیفہ مولانا عبدالرحیم صاحبؒ و خلیفہ مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ سے بیعت ہو گئے اور اپنا تمام وقت مطالعۂ قرآنی و مجاہدہ میں گذارنے لگے۔ جس نے انہیں دوسری طرف دیکھنے کی مہلت ہی نہیں دی ؎

کسے خبر کہ ہزاروں مقام رکھتا ہے
وہ فقر جس میں ہو بے پردہ روحِ قرآنی

پیر و مرشد عبدالقادر صاحبؒ کو رامپور سے عشق تھا، ان کی زندگی کا قیمتی وقت موجودہ مسٹن گنج (جو کبھی مدرسہ عالیہ تھا) میں گذرا تھا۔ رامپور کی مختلف مساجد میں آپ کی رہائش رہی تھی۔ طالب علمی کے بعد جب حضرت عالمی شہرت یافتہ بزرگ ہو گئے تھے جب بھی متعدد بار رامپور تشریف لائے اور اپنی طالب علمی کے دور کے مدارس کو دیکھ کر حسرت سے ان مقامات کو یاد کیا کرتے ؎

مدارس آیات خلت من تلاوۃ
ومنزل علم مقفرات العرصات

(وہ مقام جہاں شب و روز درس قرآن ہوتا تھا۔ آج علم و عرفان سے محروم ہے۔ اور خاک اڑ رہی ہے)۔

مدرسہ عالیہ کی ابتدائی عمارت جہاں علامہ عبدالعلی بحر العلوم و ملاحسن نے درس دیا تھا وہاں اب قبرستان ہے۔ دوسری عمارت جہاں علامہ شبلی، مولانا عبدالقادر صاحب رائے پوریؒ اور مولانا عبیداللہ سندھی نے تعلیم حاصل کی تھی، وہاں غلہ منڈی ہے۔

مولانا عبدالوہاب صاحب میں باطنی استعداد بہت تھی، آپ کا دل دکھا ہوا تھا، پیر و مرشد نے جلد ہی تمام مقامات سلوک طے کرائے اور خلیفہ مجاز بنا دیا۔

مولانا کا خاندان رامپور کا قدیم خاندان ہے جن میں علماء دین بھی ہیں، فضلاء دنیا بھی، لیکن مولانا جیسا نہ اجداد میں تھا اور نہ اخلاف میں ہے۔

مولانا کی داستان حیات کافی المناک ہے آپ سماجی و سیاسی زندگی میں اس لئے داخل ہوئے تھے کہ ؎

شرم آتی ہے اس شہر میں ہم ہیں کہ جہاں
نہ ملے بھیک تو لاکھوں کا گذارہ بھی نہ ہو

مستقبل کا مورخ "تاریخ حریت ہند" میں دھندلے نقوش دیکھے گا اور ان کا کوئی بڑا کارنامہ نظر نہ آئے گا تو معذرت کے طور پر یہی لکھے گا،

"کہتے ہیں کہ وہ بڑے تھے لیکن ان کا کوئی بڑا کارنامہ نہیں ہے یہ تنگ دلوں اور تنگ نظروں کا فیصلہ ہے"۔

مرد غازی کے کارنامہ کا اندازہ مقبوضات کی وسعت، مالِ غنیمت کی فراوانی، جشن و جلوس کی ہماہمی و طرب انگیزی، تمغہ اور اسلحہ کی چمک اور جھنکار سے نہیں کیا جاتا، بلکہ اس کا اندازہ کیا جاتا ہے ٹوٹی ہوئی تلوار، بکھری ہوئی زرہ، بہتے ہوئے لہو، دہکتی ہوئی روح اور دمکتے ہوئے چہرہ، گرجتی ہوئی آواز . . . . . . اور ڈوبتے ہوئے سورج سے۔



# دس دن —— پانچ دریاؤں کی سرزمین میں

اسحٰق جلیس ندوی

چھٹی اور آخری قسط

ریبیون کے نامہ نگار نے کئی سوالات کئے، مولانا نے ان سوالات کا تشفی بخش جواب دیا، اس گفتگو میں جناب عبدالکریم صاحب پاریکھ اور مفتی عبدالعزیز صاحب نے بھی حصہ لیا، دن بھر لوگوں سے ملاقات کا سلسلہ رہا، عصر کے بعد عرب طلبہ کا اجتماع ہوا، چندی گڑھ کے تعلیمی اداروں میں عرب طلبہ کی معتد بہ تعداد ہے اور ان میں سے اکثر دینی ذہن کے حامل اور اسلامی تحریکات سے متاثر ہیں، مولانا کی تصنیفات کا ان میں سے بیشتر نے مطالعہ کیا تھا، عربی تقریر کے بعد مختلف مفید سوالات اور معلومات افزا جوابات کا سلسلہ شروع ہوا، یہ نشست بہت نفع بخش اور پُر تاثیر رہی۔

ہندوستان کی مختلف یونیورسٹیوں میں عرب ممالک کے طلبہ کی خاصی تعداد ہے۔ مگر ان کی صحیح رہنمائی اور تربیت کا کوئی نظم نہیں، ان کے غلط تحریکات اور افراد کا شکار ہونے کا اندیشہ اب حقیقت بن چکا ہے، ان نوجوانوں سے رابطہ اور ان کی صحیح دینی خطوط پر رہنمائی وقت کی اہم ضرورت ہے، یہی عنصر مستقبل میں ان ممالک کی قسمت کا مالک ہوگا اور اس کے ہاتھ میں اپنے ملک و معاشرہ کی باگ ڈور ہوگی، ہر علاقہ کے دینی ذہن کے لوگوں کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ اِن عرب نوجوانوں سے رابطہ رکھیں، انہیں یہ احساس دلائیں کہ وہ وسیع اسلامی سوسائٹی کے جو پوری دنیا میں موجود ہے ایک اکائی ہیں، ان طلبہ کو عید اور مختلف اجتماعی پروگراموں میں مدعو کریں، انکی تعلیمی مشکلات میں مدد کریں، ان سے اپنے خاندان کے فرد کی طرح اپنائیت، محبت، خلوص اور خیر خواہی کا معاملہ کریں تاکہ غریب الوطنی میں انہیں مسلم خاندان کے ایک فرد ہونے اور اسلامی اخوت کی بنیاد پر سوچنے کا احساس پیدا ہو، حضرت مولانا ہندوستان میں جہاں تشریف لے جاتے ہیں مقامی دیندار مسلمانوں اور اسلامی الفکر نوجوانوں کو عرب ممالک سے آئے ہوئے طلبہ سے رابطہ کی طرف خاص طور پر متوجہ فرماتے ہیں۔

مغرب کی نماز تک سینکڑوں کی تعداد میں لوگ جمع ہو گئے۔ نماز مغرب کے بعد جلسۂ عام تھا، جس کا نظم جامع مسجد کے بالمقابل وسیع میدان میں تھا، بعد نماز مغرب جلسہ شروع ہوا، سامعین سے (جن میں اکثریت ہندو اور سکھ بھائیوں کی تھی) پورا شامیانہ پُر ہو چکا تھا، ایک گوشہ میں خواتین کی نشست کا انتظام تھا، اس میں بھی بیشتر تعداد غیر مسلم خواتین کی تھی، وسیع اسٹیج پر کمشنر شری چترویدی، سکھ گرنتھی صاحبان اور ہندو پنڈت اور ممبران اسمبلی، غرض مختلف مذاہب اور مکاتب خیال کے سر برآوردہ حضرات تشریف فرما تھے، جلسے کی کارروائی مولوی شکیل احمد صاحب قاسمی نے شری چترویدی (کمشنر چندی گڑھ) کی تحریک صدارت سے شروع کی، افتتاحی کلمات راقم سطور نے کہے اس کے بعد تعارفی تقریر مولانا خلیل الرحمٰن صاحب لدھیانوی فرزند مولانا حبیب الرحمٰن صاحب لدھیانویؒ کی، اس کے بعد حضرت مولانا کی مؤثر ترین تقریر ہوئی، یہ تقریر مسلسل ڈیڑھ گھنٹہ تک جاری رہی، سامعین کے تاثر اور انہماک کا یہ عالم تھا کہ دوران تقریر دو مرتبہ بجلی فیل ہوئی اور ایک مرتبہ لاؤڈ اسپیکر فیل ہو گیا، لیکن ایک شخص بھی اپنی جگہ سے نہیں اٹھا، ہزاروں کا مجمع پورے سکون کے ساتھ اول سے آخر تک پوری توجہ سے تقریر سنتا رہا، درمیان میں سکھ بھائیوں کی زبان سے بے ساختہ تائید و تحسین کے جملے نکل آتے، اسٹیج پر راقم کے قریب بیٹھے ہوئے ایک سکھ گرنتھی صاحب کو میں دیکھ رہا تھا کہ وہ ہر جملے پر جھوم اٹھتے اور کہتے۔ "اسے کہتے ہیں مسلمان"۔ "ایسے ہوتے ہیں مسلمان"۔ افسوس ہے کہ اس تقریر کو ریکارڈ کرنے کی کوشش رائیگاں گئی، کسی خرابی کی وجہ سے یہ تقریر ٹیپ نہ ہو سکی، حضرت مولانا کے خطاب کے بعد صدر جلسہ شری چترویدی نے مولانا کی تقریر کا خلاصہ بیان کیا جس میں تقریر کے تمام اہم نکات کا احاطہ کیا گیا تھا، انہوں نے اپنے قلبی تاثر کا اظہار کرتے ہوئے اور

سامعین کے تاثرات کی ترجمانی کرتے ہوئے یہ بھی کہا کہ "تین مرتبہ بجلی فیل ہونے اور ایکبار لاؤڈ اسپیکر کے کام نہ کرنے کے باوجود ہزاروں انسانوں کے اس جلسہ میں بغیر کسی اضطراب و انتشار کے سکون سے تقریر کا جاری رہنا اس بات کی علامت ہے کہ مولانا ندوی صاحب تمام لوگوں کے دل کی ترجمانی کر رہے تھے، ورنہ وہ کونسی طاقت تھی کہ جو اس مجمع کو اپنی جگہ جمائے ہوئے تھی۔ جلسے کے اختتام کا اعلان ہوا تو لوگ جوق در جوق مولانا سے تعارف، مصافحہ اور ملاقات کے لئے بڑھنے لگے، یہاں بھی ملنے والوں میں بڑی تعداد غیر مسلم بھائیوں کی تھی۔

عشاء بعد اجتماعی کھانا ہوا، مالیر کوٹلہ، سرہند اور اطراف و اکناف سے آئے ہوئے تمام لوگوں کے طعام کا نظم منتظمین نے کیا تھا، جناب عبدالکریم صاحب پاریکھ، ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی اور مولانا کے دیگر رفقاء سے رات دیر تک لوگ تبادلۂ خیال کرتے رہے، ان میں غیر مسلم بھائیوں کی دلچسپی اور اظہار تعلق کو دیکھ کر اپنے اس احساس کو تقویت پہونچی کہ آج بھی ذہن و قلب کے بند دروازے کھل سکتے ہیں، بشرطیکہ ان پر سلیقہ سے دستک دی جائے۔

شب گذری، نماز صبح کے بعد ہم ایر فورس کالونی میں ناشتہ پر مدعو تھے، ایر فورس میں علیم الدین صاحب نامی ایک صاحب حضرت مولانا سے ارادت کا تعلق رکھتے ہیں، یہ ہر سال ماہ رمضان کے آخری عشرہ میں تکیہ کلاں رائے بریلی میں اعتکاف کرتے ہیں۔ انہوں نے ناشتہ پر مدعو کیا تھا، مہمانوں کے علاوہ کئی مقامی احباب مدعو تھے۔

چندی گڑھ سفر پنجاب کی آخری منزل تھی، دن کے گیارہ بجے ہم بذریعہ بس رائے پور کے لئے روانہ ہوئے، سہارنپور کے بس اڈہ پر مدرسہ اسلامیہ ریڑھی تاجپورہ کے دو اساتذہ دو کاروں کے ساتھ منتظر ملے، نماز ظہر ادا کر کے انہی کاروں میں ہم رائے پور پہونچے۔

رائے پور، شہر سہارنپور سے بجانب شمال ۲۲ میل پر واقع ہے، ابھی چند سال قبل خدا کے ایک مقبول بندے کی برکت سے اس ویرانے کی رونق پر متمدن آبادیاں نثار ہوتی تھیں، یقین و معرفت کی جو شمع یہاں روشن تھی اس نے نہ جانے کتنے دلوں کو منور کیا، انسانیت کی ان صحت گاہوں کے متعلق حضرت مولانا شاہ عبدالقادر صاحب رائے پوریؒ کے سوانح نگار لکھتے ہیں، "جنھوں نے ہندوستان میں فقر و تصوف کی تاریخ پڑھی ہے یا کبھی اس مقصد و ذوق کے ساتھ اس ملک میں سفر کیا ہے، وہ جانتے ہیں کہ جس طرح شیر شاہ سوری نے اپنی تاریخی شاہراہ پر دور دور تھوڑے تھوڑے فاصلے سے کارواں سرائیں تعمیر کرائی تھیں، جہاں مسافر قیام کرتے، خوراک، حفاظت اور آرام کی جگہ پاتے اور راہ کی خستگی و ماندگی دور کر کے تازہ دم ہو کر اپنا سفر شروع کرتے، اس طرح فیاض دل اور فیاض روح درویشوں اور انسانیت کے چارہ سازوں نے زندگی کے تھکے ہارے مسافروں اور مادیت کے تقاضوں اور مطالبوں سے پامال کئے ہوئے، انسانوں کے لئے، جن کو اپنے دل کی زندگی دم توڑتی اور روح کا شعلہ بجھتا نظر آتا تھا، ایسی پناہ گاہیں اور کارواں سرائیں تعمیر کی تھیں، جہاں کچھ دن ٹھہر کر دل کے چراغ کی لو نیا روغن اور روشنی پاتی، افسردہ قویٰ میں تازگی اور روح میں جلا پیدا ہوتی"۔ انسانیت کی انہی کارگاہوں میں اس زمانہ میں رائے پور کی خانقاہ کو بڑی شہرت حاصل تھی، بقول مولانا ندوی،

"رائے پور کی خانقاہ نہ صرف اس نواح بلکہ صوبہ جات متحدہ سے لے کر پنجاب تک کا روحانی و تربیتی مرکز بن گئی، ملک میں بڑے بڑے انقلاب آئے، بڑے بڑے سیاسی